Nazeer Sons Publishers

کلیات

کنہیالال کپور

(طنز و مزاح)

کُلیاتِ کنہیالال کپُور

(طنز و مزاح)

کنہیالال کپُور

نذیر سنز پبلشرز

140اے اردو بازار لاہور فون: 042-37123219

بانیِ ادارہ: نذیر سنز پبلشرز

والدمحترم نذیر حسین 1941 - 2005

اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

2014

تحسین حسین، محمد شہزاد، محمد عمران

نے نذیر سنز پبلشرز لاہور سے شائع کی

گنج شکر پرنٹرز۔ لاہور

نذیر سنز پبلشرز

40اے اردو بازار لاہور فون:37123219-042

info@nazeersons.com

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا

(طنز و مزاح)

کنہیالال کپُور

نذیر سنز پبلشرز

40اے اردو بازار لاہور فون:37123219-042

info@nazeersons.com

بانیِ ادارہ: نذیر سنز پبلشرز

والدمحترم نذیر حسین 1941 - 2005

اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔آمین

2014

تحسین حسین، محمد شہزاد، محمد عمران

نے نذیر سنز پبلشرز لاہور سے شائع کی

گنج شکر پرنٹرز۔لاہور

نذیر سنز پبلشرز

40اے اردو بازار لاہور فون:042-37123219

info@nazeersons.com

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ خود کو زندگی کے جھمیلوں سے آزاد کر کے چند گھنٹوں کے لیے کنہیالال کپور کی کہانیاں پڑھیں اس سے کم از کم یہ ہوگا کہ آپ کا وہ دن بہت اچھا گزرے گا اور آپ آئندہ کے لیے بھی کنہیالال کپور کو پڑھے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

کنہیالال کپور کی طنزیہ، مزاحیہ کہانیوں میں جو ثقافت، کاٹ، نشتریت اور وسعت پائی جاتی ہے وہ شاید اردو کے کسی دوسرے طنز نگار کے ہاں ملنا مشکل امر ہے جو قارئین ظرافت کے عنصر کو پسند کرتے ہیں کنہیالال کپور کی تحریروں کو پڑھ کر ان کی امنگیں مزید جوان ہو جائیں گی اور مسرت و شادمانی ان کی زندگی کا حصہ بن جائے گی۔

☆.....☆.....☆

تعارف

کنہیالال کپور کا شمار برصغیر پاک و ہند کے ان ممتاز طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی مزاحیہ تحریروں کے ذریعے طنز و مزاح کی نئی نئی جہتیں دریافت کیں۔

ان کی تحریروں میں معاشرے میں پائی جانے والی سماجی برائیوں کے بارے میں بڑے دلگداز، دلنشین، منفرد اور اچھوتے انداز میں نشاندہی کی گئی ہے۔ اور اس ضمن میں انہوں نے اپنی تحریروں میں نہ صرف سماجی برائیوں کی نشاندہی کی ہے بلکہ انہیں تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہوئے بڑی بے دردی اور ہنرمندی کے ساتھ شدید چوٹیں بھی کی ہیں۔ ان کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے ایک سنجیدہ قاری بھی اپنی بے اختیار ہنسی پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ اگرچہ ان کی کہانیوں میں کہیں بھی گہرائی کا عنصر نظر نہیں آتا تاہم معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں کی حقیقتیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریر میں شگفتگی کے علاوہ کئی ایسی چیزیں بھی مل جاتی ہیں جو سب کی سب کام کی چیزیں ہیں۔ انہی چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے کنہیالال کپور نے آنے والے مزاح نگاروں کو نئی راہوں پر چلنے کا سلیقہ بتلایا ہے۔

فہرست

مضامین	صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر
تعارف	5	فضول صاحب اوران کے تلامذہ	60
غالب کے دوسوال	7	مشورہ ہمسائے کو!	63
نیند کیوں رات بھر	9	ایک حد سے موٹی فلم ایکٹرس کو	64
عورتوں کا سال	13	ایک ظالم ساس کو	65
روش بدلی زمانے کی	16	ہلڑ مچانے والے شرابیوں کو	65
کبیر صاحب	20	ملاوٹ کرنے والے کو!	66
مختصر ترین افسانے	29	جب انہوں نے کالج کھولا	67
میں نے عذاب پور میں کیا دیکھا	32	بالغوں کے لیے پہلی کتاب	70
کہاوتیں دھوکا دیتی ہیں	36	دوسرا سبق (کسان ٹریکٹر چلا رہا ہے)	70
ہم نے ایک سرائے کا ادگھاٹن کیا	39	تیسرا سبق (پروفیسر طلبہ کو پڑھا رہا ہے)	71
لغات جدید	42	چوتھا سبق (کالج کا طالب علم)	71
ناچ میری بلبل	47	پانچواں سبق (کالج کی طالبہ)	72
چار فن کار	50	چھٹا سبق (نفقی ڈاکٹر)	73
لغات جدید تر	53	ساتواں سبق (نفقی سادھو)	73
اپنے ہمسائے سے	57	آٹھواں سبق (نفقی جوتشی)	74

نواں سبق (نقلی پروفیسر)	75	عالموں سے ملاقات	133
بالغوں کے لیے دوسری کتاب		ملک ادب کے بانکے	137
جانوروں کا بیان	75	ماسٹر کرامت	140
بالغوں کے لیے تیسری کتاب		نہ کاہو سے دوستی	143
تاریخ کا ایک سبق	82	مرزا کامل	146
اور ابلیس نے کہا	88	بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا	150
غالب کے اڑیں گے پرزے	91	مسٹر قریشی	154
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ	96	راشی پھل	157
بیس سو ستر	99	خواجہ عیار	161
ڈاکٹر بالغ	103	نسخہ	166
قہوہ خانے میں	108	فتنہ بٹالوی	169
شیخ سلی	113	شکوہ صاحب	172
ہم نے اپنا بھارتہ کرن کیا!	117	چچا سلیمان	176
غربت کا خاتمہ	121	آخری الفاظ	182
ذاتی مسائل	126	بات تو سنئے	186
چکور بھوپالی	130	غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں	188

غالب کے دو سوال
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ایک دن مرزا غالب نے مومن خان مومن سے پوچھا ''حکیم صاحب! آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ مومن نے جواب میں کہا۔

''مرزا صاحب! اگر درد سے آپ کا مطلب داڑھ کا درد ہے تو اس کی کوئی دوا نہیں، بہتر ہوگا، آپ داڑھ نکلوا دیجئے، کیونکہ ولیم شکسپیئر نے کہا ہے۔ وہ فلسفی ابھی پیدا نہیں ہوا، جو داڑھ کا درد برداشت کر سکے۔

مرزا غالب نے حکیم صاحب کی سادہ لوحی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے فرمایا۔ ''میری مراد داڑھ کے درد سے نہیں، آپ کی دعا سے ابھی میری تمام داڑھیں کافی مضبوط ہیں''۔

''تو پھر شاید آپ کا ارشاد دردِ سر کی طرف ہے۔ دیکھئے مرزا صاحب، حکماء نے دردِ سر کی درجنوں قسمیں گنوائی ہیں۔ مثلاً آدھے سر کا درد، سر کے پچھلے حصے کا درد، سر کے اگلے حصے کا درد، سر کے درمیانی حصے کا درد، ان میں ہر درد کے لیے ایک خاص بیماری ذمہ دار ہوتی ہے۔ اگر کنپٹیوں پر ہوتا ہے تو ہو سکتا ہے آپ کی بینائی کمزور ہو گئی ہو، دراصل دردِ سر کو مرض نہیں مرض کی علامت سمجھا جاتا ہے''۔

''بہر حال چاہے یہ مرض ہے یا مرض کی علامت، مجھے درد کی شکایت نہیں ہے''۔

''پھر آپ ضرور دردِ جگر میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ آپ نے اپنے کچھ اشعار میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے''۔ مثلاً

یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یا

حیران ہو دروں دل کو یا پیٹوں جگر کو میں

مرزا صاحب، حکماء نے اس مرض کے لیے ''پیتا'' کو اکسیر قرار دیا ہے۔ کسی تک بندنے کیا خوب کہا ہے:

جگر کے فعل سے انسان ہے جیتا
اگر ضعف جگر ہے کھا پیتا

''آپ کا یہ قیاس بھی غلط ہے۔ میرا آج تک اس مرض سے واسطہ نہیں پڑا''۔

''تو پھر آپ اس شاعرانہ مرض کے شکار ہو گئے ہیں، جسے درد دل کہا جاتا ہے اور جس میں مبتلا ہونے کے بعد میر کو کہنا پڑا تھا:

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

''معلوم ہوتا ہے اس ڈومنی نے، جس پر مرنے کا آپ نے اپنے ایک خط میں ذکر کیا ہے آپ کو کہیں کا نہیں رکھا''۔

''واہ حکیم صاحب! آپ بھی دوسروں کی طرح میری باتوں میں آ گئے۔ ابھی قبلہ کیسی ڈومنی، اور کہاں کی ڈومنی، وہ تو میں نے یونہی مذاق کیا تھا۔ کیا آپ واقعی مجھے اتنا سادہ لوح سمجھتے ہیں کہ مغل زادہ ہو کر میں ایک ڈومنی کی محبت کا دم بھروں گا۔ دلی میں مغل زادیوں کی کمی نہیں۔ ایک سے ایک حسین و جمیل ہے۔ انہیں چھوڑ کر ڈومنی کی طرف رجوع کرنا بالکل ایسا ہے جیسا کہ آپ نے اپنے شعر میں بیان کیا ہے:

اللہ رے گمرہی! بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

''خدانخواستہ کہیں آپ کو جوڑوں کا درد تو نہیں۔ دائمی زکام کی طرح یہ مرض بھی اتنا ڈھیٹ ہے کہ مریض کی ساری عمر جان نہیں چھوڑتا بلکہ کچھ مریض تو مرنے کے بعد بھی قبر میں اس کی شکایت کرتے سنے گئے ہیں۔ عموماً یہ مرض جسم میں تیزابی مادہ کے زیادہ ہو جانے سے ہوتا ہے''۔

''تیزابی مادہ ختم کرنے کے لیے ہی تو میں ہر روز تیزاب یعنی شراب پیتا ہوں۔ ہومیوپیتھی کا اصول ہے کہ زہر کا علاج زہر سے کیا جانا چاہیے، خدا جانے یہ سچ ہے یا جھوٹ لیکن یہ حقیقت ہے کہ شراب نے مجھے اب تک جوڑوں کے درد سے محفوظ رکھا''۔

''پھر آپ یقیناً دردِ گردہ میں مبتلا ہیں۔ یہ درد اتنا ظالم ہوتا ہے کہ مریض تڑپ تڑپ کر بے حال ہو جاتا ہے''۔

''میرے گردے ابھی تک سلامت ہیں، شاید اس لیے کہ بڑے دل گردے کا انسان ہوں۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کو محض رہم ہو گیا ہے کہ آپ کو درد کی شکایت ہے اور وہم کی دوا لقمان حکیم کے پاس تھی نہ حکیم مومن خاں کے پاس ہے۔''

''قبلہ میں اس درد کا ذکر کر رہا ہوں جسے عرف عام بھی ''زندگی'' کہتے ہیں''۔

''اچھا زندگی! اس کا علاج تو بڑا آسان ہے، ابھی عرض کیے دیتا ہوں۔'' ''ارشاد''۔

''کسی شخص کو بچھو نے کاٹ کھایا، درد سے بلبلاتے ہوئے اس نے ایک بزرگ سے پوچھا، اس درد کا بھی کوئی علاج ہے۔ بزرگ نے فرمایا ''ہاں ہے اور وہ یہ کہ تین دن چیختے اور چلاتے رہو، چوتھے دن درد خود بخود کافور ہو جائے گا''۔

''سبحان اللہ! حکیم صاحب۔ آپ نے تو گویا میرے شعر کی تفسیر کر دی''۔

''کون سے شعر کی قبلہ''۔

''اس شعر کی قبلہ''۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

☆☆☆

نیند کیوں رات بھر.....

ایک مرتبہ مرزا غالب نے شیخ ابراہیم ذوق سے کہا ''شیخ صاحب! نیند کیوں رات بھر نہیں آئی؟'' ذوق نے مسکرا کر فرمایا۔ ''ظاہر ہے، جس کمرے میں آپ سوتے ہیں وہاں اتنے مچھر ہیں کہ وہ رات بھر آپ کو کاٹتے رہتے ہیں۔ اس حالت میں نیند آئے بھی تو کیسے؟ معلوم ہوتا ہے یا تو آپ کے پاس مسہری نہیں اور اگر ہے تو اتنی بوسیدہ کہ اس میں سے مچھر اندر گھس آتے ہیں۔ میری مانئے تو آج ایک نئی مسہری خرید لیجئے''۔

غالب نے ذوق کی ذہانت میں حسب معمول اعتقاد نہ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''دیکھئے صاحب! آخر ہم مغل زادے ہیں۔ اب اتنے گئے گزرے بھی نہیں کہ ہمارے پاس ایک ثابت و سالم

مسہری بھی نہ ہو۔ اور جہاں تک کمروں میں مچھروں کے ہونے کا سوال ہے، ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں جب سے ڈی۔ ڈی۔ ٹی چھڑکوائی ہے، ایک مچھر بھی نظر نہیں آتا۔ بلکہ اب تو مچھروں کی گنگناہٹ سننے کے لیے ہمسائے کے ہاں جانا پڑتا ہے''۔

''تو پھر آپ کے پلنگ میں کھٹمل ہوں گے''۔

''کھٹملوں کے مارنے کے لیے ہم پلنگ پر گرم پانی انڈیلتے ہیں، بستر پر کھٹمل پاؤڈر چھڑکتے ہیں۔ اگر پھر بھی کوئی کھٹمل بچ جائے تو وہ ہمیں اس لیے نہیں کاٹتا کہ ہمارے جسم میں اب لہو کتنا رہ گیا ہے۔ خدا جانے پھر نیند کیوں نہیں آتی''۔

''معلوم ہوتا ہے آپ کے دماغ میں کوئی الجھن ہے''۔

''بظاہر کوئی الجھن نظر نہیں آتی۔ آپ ہی کہئے بھلا مجھے کون سے الجھن ہو سکتی ہے''۔ ''گستاخی معاف! سنا ہے آپ ایک ڈومنی پر مرتے ہیں اور آپ کو ہماری بھابی اس لیے پسند نہیں کیونکہ اسے آپ کے طور طریقے ناپسند ہیں۔ ممکن ہے آپ کے تحت الشعور میں یہ مسئلہ چٹکیاں لیتا رہتا ہوں، آیا امراؤ بیگم کو طلاق دی جائے یا ڈومنی سے قطع تعلق کر لیا جائے''۔

''واللہ شیخ صاحب۔ آپ کو بڑی دور کی سوجھی! ڈومنی سے ہمیں ایک شاعرانہ قسم کا لگاؤ ضرور ہے، لیکن جہاں تک حسن کا تعلق ہے، وہ امراؤ بیگم کی گرد کو نہیں پہنچتی''۔

''تو پھر یہ بات ہو سکتی ہے۔ آپ محکمہ انکم ٹیکس سے اپنی اصلی آمدنی چھپا رہے ہیں اور آپ کو یہ فکر کھائے جاتا ہے کہ کسی دن آپ کے گھر چھاپہ پڑ گیا تو ان اشرفیوں کا کیا ہوگا جو آپ نے زمین میں دفن کر رکھی ہیں اور جس کا پتا ایک خاص قسم کے آلہ سے لگایا جا سکتا ہے''۔

''اجی شیخ صاحب۔ کیسی اشرفیاں! یہاں زہر کھانے کو پیسہ نہیں، شراب تو قرض کی پیتے ہیں اور اسی خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہماری فاقہ کشی رنگ لائے گی۔ اگر ہمارے گھر چھاپہ پڑا تو شراب کی بوتلوں اور آم کی گٹھلیوں کے علاوہ کوئی چیز نہیں ملے گی''۔

''اچھا، وہ جو آپ کبھی کبھی اپنے گھر کو ایک اچھے خاصے قمار خانے میں تبدیل کر دیتے ہیں: اس کے متعلق کیا خیال ہے''۔

''واہ شیخ صاحب! آپ عجیب باتیں کرتے ہیں۔ تھوڑا بہت تو جواہر مہذب شخص کھیلتا ہے اور پھر ہر کلب میں بڑے بڑے لوگ ہر شام کو ''برج'' وغیرہ کھیلتے ہیں۔ جوا آخر جوا ہے،

چاہے وہ گھر پر کھیلا جائے چاہے کلب میں''۔

''اگر یہ بات نہیں تو پھر آپ کو کسی سے حسد ہے۔ آپ ساری رات حسد کی آگ میں جلتے رہتے ہیں اور میرے اس شعر کو گنگناتے ہیں۔

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب
مجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب

''بخدا شیخ صاحب! ہم کسی شاعر کو اپنا مدِ مقابل ہی نہیں سمجھتے کہ اس سے حسد کریں۔ معاف کیجئے آپ حالانکہ استاد شاہ ہیں، لیکن ہم نے آپ کے متعلق بھی کہا تھا، ذوق کی شاعری بانگ دہل ہے اور ہماری نغمہ چنگ''۔

''مرزا صاحب۔ یہ تو صریحاً زیادتی ہے۔ میں نے ایسے شعر بھی کہے ہیں جن پر آپ کو بھی سر دُھننا پڑا ہے

''لیکن ایسے اشعار کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے''۔

''یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم اور کہا تھا آپ نے''

ع ''ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں''۔

''اگر ہم سخن فہم نہ ہوتے تو آپ کے کلام پر صحیح تبصرہ نہ کر سکتے۔ خیر چھوڑیئے بات تو نیند نہ آنے کی ہو رہی تھی''۔

''کسی ڈاکٹر سے اپنا بلڈ پریشر چیک کرایئے، ہو سکتا ہے وہ بڑھ گیا ہو''۔

''قبلہ، جب بدن میں بلڈ ہی نہیں رہا تو پریشر کے ہونے یا بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''۔

''پھر ہر رات سونے سے پہلے کسی ایسی گولی کا سہارا لیجئے جس کے کھانے سے نیند آ جائے، آج کل بازار میں ایسی گولیاں عام بک رہی ہیں''۔

''انہیں بھی استعمال کر چکے ہیں۔ نیند تو انہیں کھا کر کیا آتی، البتہ بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔ اس لیے انہیں ترک کرنے میں ہی عافیت سمجھی''۔

''کسی ماہر نفسیات سے مشورہ کیجئے شاید وہ کچھ بتا سکے؟''۔

''وہ بھی کر چکے ہیں''۔

''تو کیا تشخیص کی اس نے؟''۔

''کہنے لگا۔ آپ کے تحت الشعور میں کسی ڈر نے مستقل طور پر ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ اس سے نجات حاصل کیجئے۔ آپ کو نیند آنے لگے گی''۔

''یہ تو بڑا آسان ہے۔ آپ اس ڈر سے نجات حاصل کیوں نہیں کر لیتے''۔

''لیکن ہمیں پتا بھی تو چلے وہ کونسا ڈر ہے''۔

''اسی سے پوچھ لیا ہوتا''۔

''پوچھا تھا اس نے جواب دیا۔ اس ڈر کا پتا مریض کے سوا کوئی نہیں لگا سکتا''۔

''کسی لائق ایلو پیتھک ڈاکٹر سے ملئے۔ شاید وہ.....''۔

''اس سے بھی مل چکے ہیں۔ خون، پیشاب، تھوک، پھیپھڑے، دل اور آنکھیں ٹیسٹ کرنے کے بعد کہنے لگا۔ ان میں تو کوئی نقص نہیں، معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کو نیند سے الرجی ہو گئی ہے''۔

''علاج کیا بتایا؟''۔

''کوئی علاج نہیں بتایا۔ دلیل یہ دی کہ الرجی ایک لاعلاج مرض ہے''۔

''آپ اگر اجازت دیں تو خاکسار جو کہ نہ حکیم ہے نہ ڈاکٹر بلکہ محض ایک شاعر، آپ کے مرض کا علاج کر سکتا ہے''۔

''ضرور کیجئے''۔

''دیکھئے اگر آپ کو نیند رات بھر نہیں آتی، تو آپ رات کی بجائے دن میں سویا کیجئے۔ یعنی رات کو دن اور دن کو رات سمجھا کیجئے''۔

''سبحان اللہ۔ کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔ تعجب ہے ہمیں یہ آج تک کیوں نہیں سوجھا''۔ ''سوجھتا کیسے۔ آپ تو اس وہم میں مبتلا ہیں''۔

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعر نغز گوئے خوش گفتار

''شیخ صاحب آپ نے خوب یاد دلایا۔ بخدا ہمارا یہ دعویٰ تقلی نہیں۔ حقیقت پر مبنی ہے''۔

''چلئے یوں ہی سہی۔ جب تک آپ استاد شاہ نہیں ہیں مجھے آپ سے کوئی خطرہ نہیں''۔

''یہ اعزاز آپ کو ہی مبارک ہو۔ ہمیں تو پینے کو 'اولڈ ٹام' اور کھانے کو 'آم' ملتے رہیں۔ ہم خدا کا شکر بجا لائیں گے''۔

دراصل شراب پی پی کر آپ نے اپنا اعصابی نظام اتنا کمزور کر لیا ہے کہ آپ کو بے خوابی کی شکایت لاحق ہو گئی۔ اس پر ستم یہ کہ توبہ کرنے کی بجائے آپ فکر سے کہا کرتے ہیں۔ ''ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے''۔

بس بس شیخ صاحب رہنے دیجئے۔ ورنہ مجھے آپ کو چپ کرانے کے لیے آپ کا ہی شعر پڑھنا پڑے گا''۔

''کون سا شعر قبلہ؟''۔

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

☆☆☆

عورتوں کا سال

1975ء کا سب سے بڑا مذاق یہ تھا کہ اسے عورتوں کا بین الاقوامی سال قرار دیا گیا۔ گویا 1975ء سے پہلے جتنے سال تھے، وہ سب مردوں کے تھے اور 1975ء کے بعد جتنے سال آئیں گے، وہ بھی سب مردوں کے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے ہر سال عورتوں کا ہوتا ہے کیونکہ وہ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں سے تین سو چھیاسٹھ دن مردوں کو انگلیوں پر نچاتی ہیں۔ ایک عقل مند شوہر یہ نکتہ بخوبی جانتا ہے۔ چنانچہ جس طرح جہانگیر نے صرف ایک شراب کے پیالے کے عوض اپنی ساری سلطنت نور جہاں کے سپرد کر دی تھی۔ وہ دو وقت کھانے کے عوض اپنی ساری آمدنی بیوی کے سپرد کر دیتا ہے۔ نہ بھی کرے تو وہ خود اس کی جیب سے نکال لیتی ہے۔ ایک شخص اپنے دوست کو بتا رہا تھا، معلوم ہوتا ہے کل کسی جیب کترے نے میری جیب پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ اس میں پانچ سو روپے تھے۔ اب صرف پچاس ہیں۔ دوست نے کہا ''ممکن ہے آپ کی بیگم صاحبہ نے یہ رقم اڑائی ہو۔ وہ شخص بولا..... ناممکن! اگر بیگم صاحبہ جیب میں ہاتھ ڈالیں تو وہ اس میں پچاس روپے باقی نہ رہنے دیتیں۔''

ایک سمجھ دار شوہر بیوی کی کسی بات کی تردید نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے بیوی کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ خاوند کی کھوپڑی میں بھی دماغ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بیوی کی ہاں میں ہاں

ملا کر بحث کو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ کبھی یہ شکایت کرتی ہے کہ میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی تھی، جب میں آپ کے پلے پڑی تو بڑے ادب کے ساتھ کہتا ہے، ''آپ بجا فرماتی ہیں''۔

ہماری رائے میں کسی خاص سال کو عورتوں کا بین الاقوامی سال قرار دینا کافی نہیں۔ عورت اس وقت تک پہیلی بنی رہے گی، جب تک اس سے متعلق ان تمام مفروضوں کو غلط قرار نہیں دیا جاتا، جن کی اختراع مرد نے کی ہے۔ مثال کے طور پر عورت مرد کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی لیے پسلی کی طرح اس کا دماغ ٹیڑھا، مزاج ٹیڑھا اور فطرت ٹیڑھی ہے۔ وہ جب سے دنیا میں آئی ہے، مردوں کی زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔ سچ تو یہ ہے عورت اس لیے ٹیڑھی ہے کیونکہ ٹیڑھی انگلی کے بغیر گھی نہیں نکلتا۔ نیز ٹیڑھے شخص سے تمام لوگ ڈرتے ہیں۔ تلسی داس نے ٹھیک ہی کہا ہے پہلی رات کا چاند ٹیڑھا ہوتا ہے، اس لیے ہر شخص اس کو سلام کرتا ہے۔

ایک اور مفروضہ جسے اب ترک کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ ہے کہ عورت ''صنف نازک'' ہے۔ جس شخص نے بھی بہو کو ساس یا شوہر کو بیوی کے ہاتھوں پٹتے دیکھا ہے، وہ اس امر کی تصدیق کرے گا کہ عورت ''صنف کرخت'' ہے، صنف نازک نہیں۔ یہ بات یوں بھی صحیح ہے، کیونکہ عورت مرد سے زیادہ سخت جان واقع ہوئی ہے۔ عموماً اس کی عمر مرد کی عمر سے زیادہ ہوتی ہے، نیز جذباتی لحاظ سے وہ مرد کی نسبت زیادہ متوازن ہوتی ہے۔ اسی لیے پاگل خانے مردوں سے بھرے پڑے ہیں۔ کم از کم دو درجن بیماریاں ایسی ہیں جو عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً گھٹیا۔ گنجا پن اور معدے کے ناسور۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ اب عورتوں کی بجائے مردوں کو صنف نازک کا خطاب دیا جائے۔ یہ اس لیے بھی مناسب ہوگا کیونکہ آج کل نوجوان بڑی تیزی اور مستعدی سے صنف نازک میں شامل ہونے کی کوشش کر رہے۔ خاص طور پر جب سے انہوں نے عورتوں کی طرح لمبے لمبے بال رکھنا شروع کر دیئے ہیں، اور لپ سٹک استعمال کرنے لگے ہیں۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کئی بار دولہا اور دلہن کو سوچنا پڑتا ہے کہ ان میں دلہن کون ہے۔

ایک اور مفروضہ ہے، عورتیں قدرتی طور پر بزدل اور امن پسند ہوتی ہیں، اس لیے انہیں فوج میں نمائندگی نہیں دینی چاہیے۔ یہ مفروضہ حقیقت سے کسی قدر بعید ہے، اس کا تجربہ ان لوگوں کو ہوگا،

جنہوں نے عورت کو آپس میں لڑتے دیکھا ہے۔ عورت تو خدا کی وہ دلچسپ مخلوق ہے جو کسی وجہ کے بغیر بھی لڑ سکتی ہے اور لڑی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کیفی حیدرآبادی کی نظم "دو عورتوں کی لڑائی"۔

جمیلہ بی (پڑوسن سے) لڑیں گے اے پڑوسن آ۔
حمیدہ (اس کی ہمسائی) لڑی تجھ سے بلا میری۔
جمیلہ بی۔ بلا تیری ترے سر پر ترے گھر پر۔
حمیدہ۔ اے تجھے صدقے کروں گھر پر سے کیوں لونڈی۔
جمیلہ بی۔ ارے لونڈی بے حیا بدذات۔ مجھے صدقے کرے گی تو ذرا منہ دیکھ کل موئی۔
حمیدہ۔ (آگے بڑھ کر) منہ سنبھال اپنا تو اے کتیا۔ نہیں تو مارے جوتوں کے تیرے سب دانت توڑ دوں گی۔
جمیلہ۔ (دوڑ کر بال اس کی چٹیا کے پکڑ کر) مار ذرا میں بھی تو دیکھوں کتنی لمبی ہے تیری جوتی۔

ظاہر ہے اگر عورتوں کو فوج میں نمائندگی دی جائے تو توپوں، ٹینکوں اور بمباری کی لڑائی باتوں اور طعنوں کی جنگ میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس کا کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو، جانی اور مالی نقصان نہ ہونے کے برابر ہوگا۔

فوج کے علاوہ اگر عورتوں کو پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں مردوں کے برابر نشستیں دی جائیں تو کم از کم اجلاسوں کی کارروائی بڑی رنگین اور دلچسپ ہو جائے گی۔ سید ضمیر جعفری نے ایک ایسے ہی اجلاس کا نقشہ پیش کیا ہے جس میں عورتوں کی اکثریت ہے:

سب بولتی ہیں
بہ انداز غیظ و غضب بولتی ہیں
نہیں بولتی ہیں تو کب بولتی ہیں
یہ جب بولتی ہیں تو سب بولتی ہیں
شہادت کی انگشت اقبال پر ہے
کبھی ناک پر ہے کبھی گال پر ہے

صدیوں سے عورتوں کے ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ بیوی کے لیے شوہر خدائے مجازی یا پرمیشور کا درجہ رکھتا ہے۔ ہماری دانست میں اب وقت آ گیا ہے کہ شوہر کی بجائے یہ اعزاز بیوی کو

بخش دیا جائے۔ ویسے تو دبی زبان سے تمام شریف یعنی زن مرید خاوند اس صداقت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اب انہیں کھلے بندوں اس کا اعلان کر دینا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو عورتوں کی نئی پود جو امریکہ کے علاوہ کئی دوسرے ملکوں میں حقوق نسواں کے لیے جدوجہد کر رہی ہے، ڈنڈے یا بیلن کے زور سے یہ بات منوا کر چھوڑے گی۔ اس لیے اگر دو ایک مراعات دے کر عورتوں کو خوش کیا جا سکتا ہے تو یہ خسارے کا سودا نہیں ہے۔ بصورت دیگر مستقبل قریب میں مردوں کو ایک وقت کا کھانا تیار کرنے کے علاوہ بچوں کو لوری دے کر بھی سلانا پڑے گا اور ہو سکتا ہے انہیں گھر کے آنگن میں جھاڑو لگانے اور کپڑے دھونے کے لیے بھی کہا جائے۔

سب سے خطرناک مفروضہ جسے خیر باد کہنا ہوگا، یہ ہے کہ عورتوں کو جتنا حقیر سمجھا جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔ اگر انہیں چڑانے کے لیے ان شعراء کے اقوال کا حوالہ دیا جائے جنہوں نے عورت کو پیٹنے کی تلقین کی ہے تو اور بھی اچھا ہے ..... اس قسم کا دقیانوسی نظریہ آج سے پانچ سو سال پہلے پسند کیا جاتا تھا، کیونکہ اس وقت عورت کو پیٹنا مرد کا پسندیدہ شغل تھا۔ نیز عورت بھی پٹنے کو سعادت تصور کیا کرتی تھی۔ وہ زمانہ لد گیا۔ آج کل اگر عورت مرد کو نہ پیٹے، اسے ہی غنیمت سمجھنا چاہئے۔ چہ جائیکہ مرد اس کو پیٹنے کا ارادہ کرے۔ بہر حال بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ بقول شاعر

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار!

☆☆☆

روش بدلی زمانے کی

قیاس غالب ہے کہ اکبرالہ آبادی نے محض عورتوں کو خوش کرنے کے لیے یہ پیش گوئی کی تھی۔

بیویاں شوہر بنیں گی اور شوہر بیویاں

کیونکہ اگر اس میں رتی بھر صداقت ہوتی تو یہ معجزہ کم از کم 1975ء میں جسے ''عورتوں کا سال'' قرار دیا گیا تھا۔ یقیناً ظہور پذیر ہوتا لیکن 1975ء آیا اور چلا گیا اور بیویاں بیویاں رہیں اور شوہر شوہر۔

ہمارے خیال میں اگر اکبر یہ کہتے کہ وہ زمانہ جلد آنے والا ہے جب شاگرد، استاد بنیں گے اور استاد شاگرد تو انہیں "لسان العصر" کے علاوہ "اختر شناس" بھی سمجھا جاتا۔

ایک زمانہ تھا جب شاگرد استاد کی چلمیں بھرا کرتے تھے۔ چلموں کے علاوہ ان کا کلہ بھی پڑ ھتے تھے۔ خود چاہے کتنے ہی عالم و فاضل ہوتے، استاد کے آگے پانی بھرتے تھے۔ امیر خسرو کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے، مولانا الطاف حسین حالی کو مرزا غالب سے اور ڈاکٹر محمد اقبال کو داغ دہلوی سے جو ضرورت تھی وہ ضرب المثل ہو گئی ہے۔ آج کل اگر چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں تو ایسے شاگرد نہیں ملتے۔ سچ تو یہ ہے ان دنوں یا تو ایسے شاگرد نام کی چیز ہی نہیں رہی یا اس میں اتنی تبدیلی آ گئی ہے کہ اس پر استاد ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔

آج اگر استاد شاگرد کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

میں بھی ہوں اک سخن در آسن کلام اکبر
ان موتیوں سے آ کر دامن کو اپنے بھر لے

تو شاگرد بڑے تھمے کے ساتھ جواب دیتا ہے

دعویٰ بڑا ہے سوز کو اپنے کلام کا
جو غور کیجئے تو ہے کوڑی کے کام کا

اوروں کی بات چھوڑیئے، آپ ہمارے ہی شاگردوں کے کارنامے ملاحظہ فرمایئے ایک مرتبہ ہم نے اپنے شاگرد سے کہا۔ "کیا بات ہے؟ آپ کبھی کلاس روم میں نظر نہیں آئے؟" اس نے ادائے بے نیازی کے ساتھ جواب دیا۔

"معاف کیجئے۔ آپ کا لیکچر اتنا خشک ہوتا ہے کہ مجھے دردسر کی شکایت ہو جاتی ہے۔ نیز آپ کا انگریزی کا تلفظ اتنا غلط ہے کہ ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ہمارا تلفظ بھی خراب نہ ہو جائے"۔

ہمارے ایک اور شاگرد کو خواہ مخواہ بحث کرنے کی عادت ہے۔ ایک دن جب ہم شیکسپیئر کی ادبی عظمت سے کلاس کو روشناس کرا رہے تھے تو اس نے کہا۔ "قطع کلام معاف! لیکن والٹیر کہتا ہے کہ شیکسپیئر ایک غیر مہذب ڈرامہ نگار تھا اور آپ ہیں کہ اسے حرف آخر سمجھتے ہیں"۔

ہم نے والٹیر کے اعتراض کا جواب دینے کے بعد اتنا ہی کہا تھا۔

"ٹریجڈی لکھنے میں شیکسپیئر کا کوئی ثانی نہیں"۔ تو اس نے ہمیں دوبارہ ٹوکتے ہوئے

کہا۔ ''لیکن ٹالسٹائی بھی شیکسپیئر کو عظیم ادیب نہیں سمجھتا''۔

''ٹالسٹائی'' کا اپنا الگ زاویہ نگاہ ہے، وہ اس ادب کو اچھا نہیں سمجھتا جو اخلاقی اقدار کی تبلیغ نہیں کرتا''۔ ہم نے معذرت کے لہجے میں کہا۔ ''جب شیکسپیئر اخلاقی اقدار کو نظر انداز کرتا ہے تو وہ عظیم ڈرامانٹ کیسے ہو سکتا ہے''۔

''کیوں کہ وہ زندگی کی صحیح ترین عکاسی کرتا ہے''۔

''صحیح ترین عکاسی تو آئینہ ہی کرتا ہے۔ پھر شیکسپیئر اور آئینے میں کیا فرق ہوا؟''

''آئینہ شیکسپیئر کی طرح شاعری نہیں کرتا''۔

''اگر شیکسپیئر شاعری کرتا ہے، تو وہ شاعر ہوا۔ اسے ڈرامانٹ کیوں کہا جاتا ہے''۔

خیر ایسے طالب علم کو بھی برداشت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان طلبہ کا کیا کیا جائے، جو آئے دن ہمارے خلاف اس لیے اسٹرائک پر چلے جاتے ہیں کہ ان کے خیال میں ہمیں پڑھانا نہیں آتا۔ جب پرنسپل صاحب ان سے دریافت کرنے کے لیے اپنے دفتر میں بلوا بھیجتے ہیں کہ وہ کسی لیے ہم سے پڑھنا نہیں چاہتے تو ان کا لیڈر کہتا ہے

''صاحب وہ غلط انگریزی بولتے ہیں''۔ پرنسپل حیران ہو کر فرماتے ہیں۔

''وہ پچھلے بیس سال سے انگریزی پڑھا رہے ہیں۔ ہم یہ کیسے تسلیم کر لیں کہ وہ صحیح انگریزی نہیں بول سکتے؟''۔

''جناب بات یہ ہے کہ غلط انگریزی بولنے کی عادت ایک بار پڑ جائے تو مشکل سے ہی چھوٹتی ہے''۔

''اور کوئی شکایت''۔

''انگریزی ادب سے ان کی واقفیت اٹھارویں صدی تک محدود ہے۔ جدید ادب ان کی فہم سے بالاتر ہے۔ انہوں نے جدید ادباء کے نام تک نہیں سنے۔ ان کی تخلیقات پڑھنا تو دور کی بات ہے''۔

''آپ انڈر گریجویٹ اور وہ ایم اے ہیں۔ آپ کو ان کی قابلیت پر نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے''۔

''ہمیں ان پر نکتہ چینی کرنے کا پورا حق ہے''۔ ڈاکٹر جانسن نے کہا ہے:

''اس شخص کو بھی جو کرسی نہیں بنا سکتا، کسی بڑھئی کی بنائی ہوئی کرسی میں سے میخ نکالنے کا پورا

حق ہے"۔

پرنسپل صاحب اس گفتگو کا خلاصہ، جو ان کے اور طلبہ کے درمیان ہوتی ہے، ہمیں سناتے ہیں۔ ہم سرپیٹ کر رہ جاتے ہیں اور بے اختیار ہمیں پرانے زمانے کے شاگردوں کے قصے یاد آجاتے ہیں۔

ہمارے ایک شاعر دوست تقسیم ملک کے بعد لاہور سے ترک وطن کر کے دہلی پہنچے۔ انہیں شوق چرایا کہ جناب بیخود دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہاں انہوں نے ان کے آنگن میں ایک ایسا منظر دیکھا کہ ان کی روح لرز اٹھی۔ دس بارہ شاگرد جن کی عمریں پچاس پچپن سے کسی طرح سے کم نہ ہوں گی، زمین پر ناک سے لکیریں کھینچ رہے تھے اور بیخود صاحب انہیں سخت سست کہتے ہوئے یہ فقرے دوہرا رہے تھے۔

"نالائقو۔ تم نے ہماری ناک کٹوادی۔ اس مشہور شعر کی تقطیع نہیں کر سکتے اور سخن فہم ہونے کا دعویٰ کرتے ہو"۔

دوسرا قصہ مشہور فلم سٹار کندن لال سہگل سے متعلق ہے۔ آغا حشر کاشمیری کی فلم "یہودی کی لڑکی" میں ہیرو کا رول ادا کر رہے تھے۔ ریہرسل کے دوران ایک فقرہ وہ اس طرح ادا نہ کر سکے جیسے آغا حشر کو مطلوب تھا۔ آغا صاحب نے دو تین بار وہ فقرہ خود ادا کیا۔ لیکن جب اس کے باوجود سہگل ناکام رہے تو آغا صاحب کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے سہگل کے ایک تھپڑ مارتے ہوتے کہا۔

"عجیب کند ذہن سے پالا پڑا ہے"۔

"چند برس کے بعد سہگل کا شمار ہندوستان کے نامور ایکٹروں میں ہونے لگا۔ اس نے کلکتہ کی بجائے بمبئی میں قسمت آزمائی کرنے کا قصد کیا۔ کلکتہ چھوڑنے سے پہلے وہ آغا صاحب کو الوداع کہنے کے لیے ان کے مکان پر گیا۔ انہوں نے کہا۔ "سہگل صاحب، ایک مدت سے میرے دل میں کھٹک رہی ہے میں چاہتا ہوں آج اس کا اظہار کر دوں"۔

سہگل بولا۔ "فرمایئے"۔

"تمہیں یاد ہے، یہودی کی لڑکی" کے ایک مکالمے کی ریہرسل کرتے وقت تم ایک فقرہ صحیح طور پر ادا نہ کر سکے تھے اور میں نے غصے سے آ کر تمہارے ایک تھپڑ مارا تھا۔ میں اس زیادتی کے

لیے تم سے معذرت چاہتا ہوں"۔

کندن لال سہگل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اس نے آغا صاحب کے پاؤں چھوتے ہوئے کہا۔"معذرت کیسی قبلہ! آپ کے اسی تھپڑ نے تو مجھے ایکٹر بنا دیا"۔

اللہ اللہ! کتنے سعادت مند شاگرد ہوا کرتے تھے اور کتنا ناز ہوا کرتا تھا انہیں اپنے استادوں پر! اور ایک آج کل کے شاگرد ہیں جو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اپنے پروفیسر سے کہتے ہیں۔

"جی حضرت، آپ ہمیں کیا پڑھائیں گے۔آپ کی دعا سے ہم ابھی دس برس تک آپ کو پڑھا سکتے ہیں"۔

☆☆☆

کبیر صاحب

کبیر اکھڑا بازار میں

بھگت کبیر حسب معمول بازار میں کھڑا ہو کر سب کی خیر مانگ رہے تھے۔جب خیر مانگتے مانگتے ادب سے گئے تو ایک طرف کو چل پڑے تا کہ دیکھ سکیں وہ لوگ کس قماش کے ہیں جن کی خیر وہ ہر روز مانگتے ہیں۔چند قدم آگے چلنے کے بعد وہ ایک ہوٹل کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ایک بیرا ہوٹل کے مالک سے پوچھ رہا تھا۔"جناب اگر آپ اجازت دیں تو پرسوں کا بنایا ہوا مرغ کا سالن پھینک دیا جائے، کیونکہ وہ اب کھانے کے قابل نہیں رہا"۔مالک بیرے کو جھڑکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اچھے خیر خواہ ہو ہوٹل کے، جو اتنا قیمتی سالن پھینکنا چاہتے ہو۔کیا اسے گرم کر کے گاہکوں کو نہیں دیا جا سکتا"؟

"سرکار! کوئی گاہک اسے کھا کر سخت بیمار پڑ سکتا ہے"۔

"ہماری بلا سے ہمیں پیسے کمانے سے غرض ہے۔گاہکوں کی صحت سے نہیں"۔

ایک اور بیرا مالک سے کہہ رہا تھا۔"حضور ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ "رمضان پولٹری فارم" کی تمام مرغیاں مر گئی ہیں۔آپ اگر چاہیں تو ایک روپیہ فی مرغی کے حساب سے وہ خرید لی

جائیں"۔ مالک کی رائے تھی، وہ ساری فوراً خرید لی جانی چاہئیں۔ کیونکہ ایک حلال کی گئی اور ایک مری ہوئی مرغی میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ البتہ جلدی کرنا چاہیے کیونکہ اگر کسی اور ہوٹل کو پتا چل گیا تو ان کا بھاؤ دو روپیہ فی مرغی ہو جائے گا۔

بھگت کبیر ان باتوں کی تاب نہ لا کر وہاں سے آگے چلے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ شہر کے مشہور مندر کے گیٹ پر رکے۔ اتنے میں مندر میں سے ایک شخص باہر آیا، وہ ریشمی کپڑوں میں ملبوس تھا گلے میں موتیوں کی مالائیں پہن رکھی تھیں۔ وہ ایک ڈی لکس موٹر کار میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور سے بولا "سیٹھ لکشمی چندر کی کوٹھی پر لے چلو۔ بھگت کبیر نے ایک پان فروش سے پوچھا۔ "یہ کون تھے؟" اس نے جواب دیا۔ "یہ مشہور سنت بابا پرلوگ ناتھ جی ہیں۔ انہوں نے لڑکپن میں ہی سنیاس لے لیا تھا۔ آج سیٹھ لکشمی چندر نے ان کی دعوت کی ہے"۔

"یہ موٹر انہوں نے ہی بھجوائی ہوگی"۔

"نہیں یہ موٹر تو سنت جی کی اپنی ہے"۔

بھگت کبیر یہ سن کر دنگ رہ گئے اور سوچنے لگے انہوں نے لڑکپن میں ہی سنیاس لے لیا تھا۔ اگر سنیاس نہ لیتے خدا جانے کس ٹھاٹ سے زندگی بسر کرتے۔

وہاں سے چل کر بھگت کبیر ایک پرانی سرائے کے پاس پہنچے، اتنے میں انہوں نے دیکھا ایک نوجوان کا منہ کالا کر کے اسے گدھے پر سوار کیا گیا ہے اور بازار میں اس کا جلوس نکالا جا رہا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا وہ نوجوان سکول اور کالج میں پڑھنے والی لڑکیوں کو بازار میں سے گزرتے وقت چھیڑا کرتا تھا۔ آج پولیس نے عین اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ دو نوجوان لڑکیوں پر غیر مہذب آوازے کس رہا تھا۔ بھگت نے سوال کیا۔

"لیکن وہ ایسی فضول حرکتیں کیوں کرتا ہے۔ کیا اس کا دماغ خراب ہے"۔

"دماغ خراب نہیں۔ کھاتے پیتے خاندان کا لڑکا ہے، اس لیے خرمستیاں سوجھتی ہیں"۔

"کیا اس کی کوئی بہن نہیں؟"۔

"بہنیں تو اس کی چار ہیں۔ دو سکول اور دو کالج میں پڑھتی ہیں"۔

"کیا اس کو یہ خیال کبھی نہیں آیا۔ اگر کوئی لڑکا اس کی بہنوں کے ساتھ اس طرح کی چھیڑ خانی کرے تو اس کے دل پر کیا گزرے گی؟"۔

''یہ خیال آتا تو یہ ایسی واہیات حرکتیں کیوں کرتا!''۔

بھگت کبیر وہاں سے آگے چلے۔ اب تو انہوں نے اس سے زیادہ دل خراش منظر دیکھا۔ تین اشخاص کو ہتھکڑیاں پہنا کر پولیس عدالت میں پیش کرنے کے لیے لے جا رہی تھی۔ پوچھنے پر پتا چلا۔ وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ انہوں نے اپنی بہو پر مٹی کا تیل چھڑک کر اسے زندہ جلا دیا ہے، کیونکہ وہ جہیز میں اتنا روپیہ اور سونا نہیں لائی تھی جتنا وہ چاہتے تھے۔ بھگت کبیر نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''افسوس ہمارے ملک کے لوگ اتنے لالچی اور حریص ہو گئے ہیں کہ وہ بہو کو، بہو کی بجائے لاٹری سمجھنے لگے ہیں۔ کاش انہیں معلوم ہوتا کہ نرگ میں داخل ہونے کے لیے جو دروازہ سب سے بڑا ہے، اس کا نام لالچ یا حرص ہے''۔

بھگت جی اب ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ایک شخص ایک سٹول پر کھڑا ہو کر ایک مجمع سے خطاب کر رہا تھا اور پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ ''مجھے اچھی طرح دیکھ لیجیے۔ میں خدا ہوں۔ میں ایسے چمتکار دیکھا سکتا ہوں، جو شاید خدا بھی نہیں دکھا سکتا، میں ہوا میں ہاتھ لہرا کر ہر وہ چیز مہیا کر دوں گا جس کی فرمائش کریں گے بولئے آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے''۔ مجمع میں سے کسی نے کہا ''آم'' اس نے ہوا میں ہاتھ لہرایا، اس کے ہاتھ میں ایک آم آ گیا۔ کسی اور نے کہا۔ سنگترا۔ اس نے پھر وہی عمل دہرایا اور اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں سنگترا تھا۔

بھگت کبیر نے جب یہ تماشا دیکھا۔ دل ہی دل میں کہا۔ ''یہ خدائی نہیں شعبدہ بازی ہے۔ ایسے ہاتھ کی صفائی کے کھیل کئی مداری اور جادوگر دکھا سکتے ہیں۔ مجمع میں ان کے اپنے آدمی ہوتے ہیں جنہیں پہلے بتا دیا جاتا ہے کہ وہ فلاں فلاں چیز کی فرمائش کریں گے۔ یہ شخص خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ مجھے تو اس کے انسان ہونے پر بھی شک ہے، خدا اتنا ارزاں نہیں کہ بازاروں میں مجمع لگاتا پھرے''۔

بھگت کبیر نے آگے جانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ گھر لوٹنے لگے، راستے میں انہیں رہ رہ کر خیال آتا رہا۔ میں روزانہ ان لوگوں کی خیر مانگتا ہوں، کل سے مجھے سنجیدگی کے ساتھ سوچنا پڑے گا۔ کیا یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی خیر مانگی جائے۔

☆☆☆

دیکھ کبیرا رویا

بھگت کبیر نے کہا "کیوں نہ ہم بھی احمق نگر کی سیر کریں"۔ ان سے اتفاق کرتے ہوئے میں بولا۔ "خیال تو برا نہیں"۔ بھگت کبیر نے فرمایا۔

"شاید تم جانتے ہو، میری ایک کمزوری ہے۔ جب میں کوئی فضول یا مضحکہ خیز چیز دیکھتا ہوں، مجھے رونے کا دورہ پڑتا ہے"۔

"جی اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک مرتبہ آپ کو اس لیے رونے کا دورہ پڑا تھا کہ لوگ رنگی کو نارنگی کیوں کہتے ہیں"۔

"اور ایک دفعہ اس لیے کہ لوگ چلتی کو گاڑی کیوں کہتے ہیں"۔

"میری بھی ایک کمزوری ہے"۔

"وہ کیا؟"۔

"جس چیز کو دیکھ کر آپ کو رونے کا دورہ پڑتا ہے، اسے دیکھ کر مجھے ہنسی کا دورہ پڑتا ہے"۔

"پھر تو خوب مزہ رہے گا، ہم میں سے ایک زار و قطار روئے گا، دوسرا قہقہہ لگا کر ہنسے گا"۔

"اصل میں رونا اور ہنسنا ایک ہی ردعمل کے دو مختلف نام ہیں"۔

"اس میں کوئی شک نہیں، اسی لیے ہندوستانیوں کی عقل پر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی آتا ہے"۔

ہم احمق نگر میں داخل ہوئے۔ سب سے پہلے چند بھکاریوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک اندھا تھا۔ بھگت کبیر نے ان کا نام پوچھا اور یہ جاننے کے بعد کہ اس کا نام نین سکھ ہے، بھگت جی کو رونے کا دورہ پڑ گیا، بڑی مشکل سے انہیں چپ کرایا۔ اتنے میں دوسرے بھکاری نے بتایا میرا نام دولت رام ہے۔ ایک بھکارن بولی اور مجھے لکشمی کہتے ہیں۔ بھگت جی نے اپنی چھاتی پر دو ہتڑ مارا اور ڈھائیں مار کر رونے لگے۔ روتے تھے اور کہتے تھے۔ "لوگوں کو نام رکھنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا"۔ انہیں روتے ہوئے دیکھ کر کچھ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ شاید ان میں کسی نے اپنا نام سلیقے سے رکھا ہو، جسے جان کر بھگت کبیر رونا بند کر دیں۔ ایک نوجوان سے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''۔

''کٹار سنگھ''۔

''باپ کا نام؟''

''تلوار سنگھ''۔

''دادے کا نام''۔

''پستول سنگھ''۔

بھگت کبیر نے روتے ہوئے کہا۔

''پردادے کا نام مت پوچھنا۔ وہ ضرور توپ سنگھ ہوگا''۔

آگے چلے تو ایک چوک میں بڑا عجیب منظر دیکھا۔ ایک گدھا سٹیج پر کھڑا ہو کر تقریر کر رہا۔ سامعین جو سب اچھی نسل کے گھوڑے تھے، پوری توجہ سے سن رہے تھے۔ گدھا کہہ رہا تھا۔ ''مجھے اس بات کا سو فی صدی یقین ہے کہ تم گھوڑے نہیں دو صدفی صد گدھے ہو''۔

گدھے کی باتیں سن کر میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ لیکن بھگت جی نے زور و کر اپنا برا حال کر لیا۔ ان کا دھیان گدھے سے ہٹانے کی لیے میں نے دو بیبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بھگت جی! ذرا ادھر دیکھئے''۔ انہوں نے ان میں سے ایک کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا؟'' یہ لڑکی ہے یا لڑکا؟''۔

اتنے میں دوسرے نے کہا۔ ''اجی یہ لڑکا ہے''۔

بھگت جی نے پوچھا۔ ''آپ کیسے جانتے ہیں؟''۔

''کیونکہ یہ میرا بیٹا ہے''۔

''آپ اس کے باپ ہیں''۔

''نہیں میں اس کی ماں ہوں''۔

بھگت کبیر نے چلا کر کہا۔ ''آپ اس کی ماں ہیں''۔ اور انہیں رونے کا ایک زبردست دورا پڑا۔

چوک سے ہم اسپتال کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ وہ پاگل تو نہیں لیکن پاگلوں کی طرح ایک ہی بات کی رٹ لگا رہا تھا۔

بھگت کبیر نے کہا۔ ''میاں کیا رٹ لگائی ہے؟''۔

اس شخص نے جواب دیا۔ ''جی کیا پوچھتے ہو۔ جب میں نے اپنی چار لڑکیوں کی شادی کی، اس وقت جہیز دینے کا رواج تھا۔ چنانچہ چاروں کو جہیز دینا پڑا۔ اب مجھے چار لڑکوں کی شادی کرنا ہے، مگر جہیز لینے اور دینے کی قانوناً ممانعت کر دی گئی ہے''۔

بھگت جی کو اس کی بات سن کر چوتھی بار رونے کا دورہ پڑا۔ البتہ میں خوب کھل کر ہنسا اور ان سے آگے چلنے کو کہا۔

ہم اسپتال میں پہنچے۔ دیکھا کہ کسی مریض کا جگر خراب ہے، کسی کا دل۔ ڈاکٹر سب مریضوں سے کہہ رہا ہے۔

''تمہاری بیماریوں کے لیے شراب نوشی ذمہ دار ہے۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو شراب پینے سے توبہ کر لو''۔ اور تمام مریض یک زبان ہو کر جواب دے رہے ہیں۔

''زندگی رہے یا نہ رہے ہم شراب نہیں چھوڑ سکتے''۔ بھگت کبیر کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ انہوں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسی الٹی کھوپڑی کے لوگ ہیں، جنہیں زندگی سے شراب زیادہ پیاری ہے''۔

اسپتال سے ہم بابا جادو ناتھ کے مزار پر گئے۔ وہاں دیکھا سیکڑوں لوگ طرح طرح کی منتیں مان رہے اور عہد کر رہے ہیں۔ ان کی مرادیں پوری ہو گئیں تو فلاں نذر تیار کریں گے۔ بھگت جی نے مجھ سے پوچھا۔

''یہ بابا جادو ناتھ کون ہے؟''۔

''سنا ہے بڑے خدا رسیدہ فقیر تھے، آج سے کوئی چھ سو سال پہلے اس شہر میں رہا کرتے تھے''۔

''تو انہیں اللہ کو پیارے ہوئے چھ سو سال ہو گئے؟''۔

''جی ہاں''۔

''اب تو ان کی خاک بھی لحد میں نہ رہی ہوگی''۔

''اس میں کوئی شک نہیں''۔

''پھر یہ لوگ منتیں کس سے مانگ رہے ہیں''۔

''ظاہر ہے ان کے مزار سے''۔

''یعنی اینٹوں اور پتھروں سے''۔

''جی ہاں''۔

یہ سنتے ہی بھگت کبیر کو رونے کا دورہ پڑا تو دوروں کے پچھلے تمام ریکارڈ مات ہو گئے۔ انہیں چپ کرانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ چنانچہ میں انہیں روتا ہوا چھوڑ کر گھر لوٹ آیا اور آج تک سوچ رہا ہوں ایسی باتیں تو ہماری زندگی میں عام ہیں، پھر انہیں کس بات پر اتنی شدت سے رونے کا دورہ پڑا۔

☆☆☆

کہے کبیر سنو بھئی سادھو

میں بھگت کبیر، اس وقت سے جب ہند پر سکندر لودھی حکومت کرتا تھا، یعنی کوئی پچھلے ساڑھے چار سو سال سے پکار پکار کر کچھ کہہ رہا ہوں، لیکن تم میری ایک نہیں سنتے، جیسے تم سب بہرے ہو گئے ہو۔ جیسے تم سب اس چکنے گھڑے کی مانند ہو، جس پر نصیحت کی بوند پڑتی تو ہے لیکن پڑتی ہی پھسل جاتی ہے اور مجھے تمہاری ڈھٹائی جو کہ اچھی خاصی بے حیائی ہے، کو دیکھ کر کسی شاعر کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے:

نہ سمجھا عمر گذری اس بت خود سر کو سمجھاتے
پگھل کر موم ہو جاتا اگر پتھر کو سمجھاتے

مجھے یاد ہے میں نے تم سے کہا تھا۔ گھونگھٹ کے پٹ کھول دو۔ تمہیں ''پیا'' کے درشن ہوں گے۔ مگر تم نے پہلے سے بھی لمبا گھونگھٹ کاڑھ لیا اور شکایت کرنے لگے ''پیا'' نظر نہیں آتا، تم بھول گئے کہ نقاب تمہارے اپنے چہرے پر ہے۔ ''پیا'' کے چہرے پر نہیں۔ بقول شاعر

میں ہی اپنا نقاب ہوں ورنہ
تیرے منہ پر کوئی نقاب نہیں

میں نے تمہیں بتایا، دھن اور جوبن پر غرور نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن تم نے میری بات کو ہنسی میں اڑایا اور کہا کبیر کا دماغ چل گیا ہے، اس لیے ہمیں گمراہ کر رہا ہے۔ تم پہلے سے بھی زیادہ دھن اور جوبن کی نمائش کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا آج روپیہ ہی تمہارا خدا، روپیہ ہی تمہارا پیغمبر، اور روپیہ

ہی تمہارا سب سے بڑا مندر ہے۔ میں نے تم سے کہا:

ایک ہی خاک گھڑے سب بھانڈے
ایک ہی سرجن ہارا

تم نے اس کا مطلب لیا کہ کبیر نے یہ بات یونہی رواداری میں کہی ہے۔ ورنہ ہندو ایک اور مسلمان دوسری خاک سے گھڑا گیا ہے۔ صرف یہ نہیں بلکہ جس مٹی سے برہمن بنایا گیا ہے اس سے شودر نہیں بنایا گیا۔

اور اکثر ہمیں یہ شک پڑتا ہے کہ ان دونوں کو سرجن ہارا بھی ایک نہیں، اگر تم میرے اس قول پر ایمان لے بھی آئے تو پھر بھی دیکھتے رہے۔

''بات تو کبیر کی ٹھیک ہے۔ لیکن پھر بھی ہندو ہندو ہے، مسلمان مسلمان ہے، عیسائی عیسائی ہے۔ سکھ سکھ ہے''۔

اور پھر تمہیں یاد ہوگا میں نے تمہیں نصیحت کی تھی کہ خدا کو ادھر ادھر ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو تمہارے دل ہی میں رہتا ہے۔ تم صرف ایک خدا کی پوجا کرو۔ ان لوگوں کی نہیں جو خدا نہیں ہیں لیکن خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے میں نے ایک بھجن میں جو گاندھی جی کو بھی مرغوب تھا۔ کہا تھا

ہنسا جو پائے مان سرور
نال تلیا کیوں ڈولے
تیرا صاحب ہے گھٹ ماہیں
باہر نینا کیوں کھولے

یعنی اگر ہنس کو مان سرور (جھیل مل جائے تو اسے چھوٹے چھوٹے تالابوں پر بھٹکنے کی ضرورت نہیں اور تمہارا خدا تمہارے دل میں رہتا ہے اسے دیکھنے کے لیے باہر کی طرف نہیں اندر کی طرف جھانکو)

لیکن تم نے اتنے خدا بنا ڈالے کہ جن کا شمار میں آنا محال ہے۔

اگا نہ نے کیا خوب کہا ہے

بندے نہ ہوں گے جتنے خدا ہیں خدائی میں
کس کس خدا کے سامنے سجدہ کرے کوئی

اور میں نے تمہیں اکثر یہ شکایت کرتے سنا کہ ہمیں کبیر نے خدا کو پانے کا کوئی آسان طریقہ نہیں بتایا۔ تم شاید بھول گئے کہ میں نے کہا تھا۔

کبیرا من نرمل بھیا جیوں گنگا کا نیر
پاچھے پاچھے ہرے پھرے کہت کبیر کبیر

اس خیال کو یوں بھی باندھا جا سکتا ہے:

پہلے میں ایک عمر اسے ڈھونڈتا رہا
میں گم ہوا تو ڈھونڈنے نکلا خدا مجھے

خدا کو پانے کا اس سے آسان طریقہ اور کیا ہوگا، اپنے من کو اتنا صاف و شفاف بنا لو جب کہ لگاتیں ہوتا ہے، پرماتما خود تمہیں ڈھنڈنے کے لیے نکلے گا۔

کس کس بات کا ذکر کروں۔ میں نے تمہیں اتنا کچھ کہہ دیا تھا کہ اس کے بعد کسی اور کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے خدا کو ایک بنئے سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ایک ایسے ترازو ہے جس کی نہ ڈنڈی ہے نہ پلڑا، ساری دنیا کو تول رہا ہے

سائیں میرا بانیا سہج کرے ویوار
بن ڈانڈی بن پالڑے تولے سب سنسار

میرے کہنے کا مطلب تھا، تم جو گناہ یا پاپ کر رہے ہو، اس کا حساب رکھا جا رہا ہے اور ایک نہ ایک دن تمہیں یہ حساب چکانا ہوگا مگر افسوس تم پر ان سب باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اب تو کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے، اگر میں اور باقی سنت تمہیں الٹی پلٹی پڑھاتے یعنی یہ کہتے کہ انسان پانی کا بلبلہ نہیں بلکہ ایک ایسا بلبلہ ہے جو ایک بار وجود میں آنے کے بعد کبھی فنا نہیں ہوگا، یہ دنیا فانی نہیں بلکہ ہمیشہ رہنے والی ہے، گناہ میں نہ صرف لذت ہے، بلکہ گناہ کرنا سب سے بڑا ثواب ہے، دولت کی پوجا کرنے سے ہی نجات مل سکتی ہے، جو تمہارے لیے ایک کانٹا بوئے تم اس کے لیے ایک ہزار کانٹے بو دو، آدمی سے ہی سب کچھ ہوتا ہے خدا سے کچھ نہیں ہوتا۔ تو تم ان باتوں پر

عمل نہ کر کے اپنی عاقبت سنوار سکتے ہو کیونکہ تمہارا اصول ہے، تمہیں جو کچھ کرنے کو کہا جائے تم وہ کبھی نہیں کرتے۔ البتہ جو نہ کرنے کو کہا جائے، وہ ضرور کرتے ہو۔ کاش مجھے تمہارے اس اصول کا پہلے علم ہوتا اور میں کبھی تلقین نہ کرتا کہ اگر تمہیں ہوش ہے تو دنیا سے دور بھاگو اور اس حالت میں داد کو یہ نہ کہنا پڑتا۔

کبیر بچارا کہہ گیا بہت بھانت سمجھائے
دادو دنیا باوری تا کہ سنگ نہ جائے

☆☆☆

مختصر ترین افسانے

ریل کا سفر کرتے ہوئے ایک مسافر نے اپنے ہم سفر سے کہا۔

''میں بھوت پریت کے وجود پر اعتقاد نہیں رکھتا''۔ موخر الذکر حیران ہو کر بولا۔ ''واقعی'' اور یہ کہہ کر غائب ہو گیا۔ یہ ہے دنیا کا مختصر ترین افسانہ۔

اس میں ایک کامیاب کہانی کے جملہ لوازمات (آغاز۔ انجام) موجود ہیں۔

میری رائے میں اردو کے اکثر و بیشتر اشعار افسانے کہلائے جانے کے مستحق ہیں اور کوزے میں دریا بند کرنے کا محاورہ ان پر صادق آتا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا مشہور شعر لیجیے:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا جو میری شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اس شعر میں جس چابک دستی اور اختصار کے ساتھ عاشق کی پاسباں کے ہاتھوں پٹ جانے کی داستان کو قلمبند کیا گیا ہے۔ اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔

غالب کا ایک اور شعر ہے

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

سید احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم نے شیکسپیئر کا ڈرامہ، ارتھیلو، پڑھاتے وقت اس شعر کا

اطلاق ڈرامہ کے کلائمیکس (CLIMAX) پر کیا تھا۔ اس ڈرامہ میں ''ای آگو'' جو اوتھیلو کے ماتحت کام کرتا ہے، اپنے آقا کو یقین دلا دیتا ہے کہ اس کی بیوی ڈیسڈی مونا کے ایک خوبصورت فوجی نوجوان ''کشیو'' (CASSIO) کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں۔ اوتھیلو آتشِ حسد سے جلنے لگتا ہے اور ایک رات اشتعال میں اپنی بیوی کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اسے قتل کرنے کے بعد جب اس پر یہ راز کھلتا ہے تو اسے گمراہ کیا گیا ہے وہ اپنے سینے میں خنجر بھونک کر خودکشی کر لیتا ہے۔

جس بات کو کہنے کے لیے شیکسپیئر کو پانچ ایکٹ کے ڈرامے کا سہارا لینا پڑا، وہ غالب نے ایک شعر میں اس طرح کہہ دی کہ کہنے کا حق ادا ہو گیا۔

اکبر آلہ آبادی اپنے ظریفانہ کلام کی بدولت سراہے جاتے ہیں حالانکہ ان کا عاشقانہ کلام بھی اتنا ہی لائق تحسین ہے۔ ان کا اسی رنگ کا ایک شعر ہے

پھیر سکتی نہیں تقویٰ سے مجھے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

میں نے جب پہلی بار یہ شعر پڑھا فوراً میرا خیال ''شکنتلا'' کے قصے کی طرف منتقل ہو گیا۔ کالی داس کے اس شہرۂ آفاق ڈرامہ میں وشوامتر اتنی سخت ریاضت کرتا ہے کہ ''اندر'' کا تخت ڈگمگانے لگتا ہے۔ اپنی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے وہ ایک خوبصورت اپسرا ''منیکا'' کو وشوامتر کے پاس بھجواتا ہے۔ اس کے حسن و جمال کی تاب نہ لا کر وشوامتر ریاضت ترک کر کے اس کے ساتھ راز و نیاز کی پینگیں بڑھانے لگتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد منیکا ایک لڑکی کو جنم دیتی ہے جو آگے چل کر شکنتلا کہلاتی ہے۔

اب ذرا اس شعر کو وشوامتر کی اس وقت کی ذہنی کیفیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے پڑھیے۔ جب منیکا نقاب الٹ کر ان کے سامنے اس طرح آئی گویا چاندنی سی چھٹک گئی اور اکبر الہ آبادی کی ساحری اور معجز بیانی کی داد دیجئے کہ انہوں نے وشوامتر کے جذبات کی کتنی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ترجمانی کی ہے۔

ایک دفعہ شوکت تھانوی نے حفیظ ہوشیار پوری کے ایک شعر کی اپنے مخصوص انداز میں توضیح کرنے کے بعد کہا تھا کہ ہر شعر کے پیچھے ایک افسانہ چھپا ہوتا ہے۔

حفیظ کا شعر تھا

کوئی دیکھے ہمارے احترام عہد رفتہ کو
وفا پر اب بھی قائم ہیں محبت چھوڑ دی ہم نے

اس شعر کی تشریح میں شوکت تھانوی کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔

''ہمارے پڑوس میں ایک میر صاحب رہتے ہیں۔ بلکہ وہ کیا رہتے ہیں ان کی بیوی رہتی ہیں جن کو مدت ہوئی میر صاحب طلاق دے چکے۔ البتہ صبح وشام آ جایا کرتے ہیں کہ نیک بخت! کچھ سودا سلف منگانا ہو تو میں حاضر ہوں اور یہ سلسلہ برسوں سے چل رہا ہے''۔ یہ احترام عہد رفتہ نہیں تو اور کیا ہے۔ محبت بلکہ نکاح تک ختم ہو جانے کے بعد وفا پر قائم رہنے کی جیتی جاگتی مثال ہے یا نہیں۔

فیض احمد فیض نے جنہیں کسی خطا کے بغیر خطاوار ٹھہرایا گیا اور پانچ سال قید و بند کی سختیاں جھیلنے پر مجبور کیا تھا۔ اپنی معصومیت اور ارباب بست وکشاد کی زیادتی اور سینہ زوری کا تذکرہ ایک شعر میں کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ انکی آپ بیتی دو مصرعوں میں سمٹ آئی ہے:

وہ بات، سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

شیفتہ کا ایک نہایت شوخ اور چٹ پٹا شعر ہے

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

یہ شعر نہیں ایک منظوم افسانہ ہے جس میں ایک ریاکار کو جسے عرف عام میں زاہد کہا جاتا ہے، اس طرح بے نقاب کیا گیا ہے۔ کہ آئندہ وہ کسی رند پر انگلیاں نہ اٹھا سکے گا۔

اسی قبیل کا غالب کا بھی ایک شعر ہے۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا کہ ہم نکلے

یگانہ کا ایک شعر آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

اس شعر کو پڑھتے ہی ہر ملک کے پناہ گزینوں کا المیہ ذہن کے پردے پر ابھرنے لگتا ہے۔ چاہے وہ 1947ء کے ہندوستانی یا پاکستانی پناہ گزین ہوں، چاہے 1971ء کے بنگلہ دیش کے لاکھوں بدقسمت انسان ہوں۔ جنہیں ہندوستان میں پناہ لینا پڑی.....اور چاہے عرب ممالک کے پناہ گزیں ہوں جنہیں یہودیوں نے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا۔ دراصل اس شعر میں نہ صرف ایک افسانہ بلکہ ایک مکمل ناول کا پلاٹ پوشیدہ ہے۔

آخر میں اثر لکھنوی کے اس شعر کو پڑھئے اور سر دھننے کے بعد سوچئے۔ اگر یہ موضوع منشی پریم چند، کرشن چندر یا عصمت چغتائی کو سوجھ جاتا تو کتنے افسانوں کی تخلیق کی جا سکتی تھی۔ اثر فرماتے ہیں:

ادھر سے آج وہ گزرے تو منہ پھیرے ہوئے گزرے
اب ان سے بھی ہماری بے کسی دیکھی نہیں جاتی

اگر اختصار نہ صرف ظرافت بلکہ افسانہ کی بھی جان ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو کے متعدد اشعار کا شمار دنیا کے بہترین اور مختصر ترین افسانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اردو شعر کا حریف ہندی دوہا ہو تو ہو، اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

☆☆☆

میں نے عذاب پور میں کیا دیکھا

روزنامہ ''خرافات'' کے ایڈیٹر مرزا حماقت بیگ صحافی ابن صحافی ہیں۔ انہوں نے اپنا پہلا مضمون پانچ برس کی عمر میں لکھا۔ عنوان تھا۔ پیدائشی بے وقوف! اسے پڑھ کر ان کے والد صاحب نے انہیں گلے سے لگایا اور کہا۔ ''برخوردار! تم ایک دن ضرور اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے''۔ بارہ برس کی عمر میں انہوں نے اپنا دوسرا مضمون لکھا۔ عنوان تھا۔ دیوانگی بھی ایک نعمت ہے! اسے پڑھ کر ان کے والد صاحب نے فرمایا۔

''عزیز من! تم نے اپنے خاندان کو چار چاند لگا دیئے ہیں''۔ چوبیس برس کی عمر میں انہوں

نے اپنا تیسرا مضمون لکھا۔ عنوان تھا، یہ مجلس نامعقولوں کی! اس میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ اپنے خاندان کا ذکر کیا۔ اسے پڑھ کر ان کے والد صاحب کو اتنی خوشی ہوئی کہ فرط مسرت سے ان کے دل کی حرکت بند ہوگئی۔

ان کی وفات کے بعد روزنامہ ''خرافات'' کو ایڈٹ کرنے کی ذمہ داری مرزا حماقت بیگ نے سنبھال لی۔ انہوں نے نہ صرف اخبار کے ظاہری حسن میں اضافہ کیا بلکہ ایڈیٹوریل لکھنے میں کتنی جدتیں پیدا کیں۔ ان میں سب سے دلچسپ یہ تھی کہ ایک ہی موضوع پر دس اور کبھی کبھی پندرہ یا بیس ایڈیٹوریل لکھا کرتے۔ کئی بار قارئین کا شک ہونے لگتا وہ ایڈیٹوریل نہیں کتاب لکھ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے ''نیا سال مبارک ہو''۔ پر پچیس ایڈیٹوریل لکھے جنہیں پڑھ کر قارئین بے حال ہوگئے اور ان سے درخواست کی کہ خدا کے لیے یہ سلسلہ بند کیجئے، نہیں تو ہم پاگل ہو جائیں گے۔

مرزا حماقت بیگ اکثر فخر سے کہا کرتے۔ ''اگر ہم چاہیں تو ایک ہی موضوع پر تین سو پینسٹھ ایڈیٹوریل لکھ سکتے ہیں۔ ان کا ایڈیٹوریل لکھنے کا انداز واقعی اچھوتا اور نرالا ہے۔ عموماً پہلے پانچ مضامین میں وہ مضمون کی تمہید باندھا کرتے ہیں۔ اس کے بعد آنے والے سات مضامین میں یہ بتایا کرتے ہیں کہ انہوں نے اتنی لمبی تمہید کیوں باندھی۔ باقی مضامین میں یہ اعتراف کیا کرتے ہیں کہ ہم جس موضوع پر لکھ رہے ہیں، اس کے متعلق ہماری معلومات غایت درجہ محدود ہیں۔ لیکن ایک خاص ایڈیٹوریل کو تو اتنا پسند کیا گیا کہ قارئین کے اصرار پر انہیں اسے کتابی صورت میں چھاپنا پڑا۔ اس ایڈیٹوریل کا عنوان ہے۔

''میں نے عذاب پور میں کیا دیکھا؟''۔

اس موضوع پر انہوں نے بیس مضامین لکھے ہیں۔ دراصل صرف دس ہی لکھے ہیں، کیونکہ پچھلے دس مضامین میں وہی باتیں دہرائی گئی ہیں، جن کا ذکر پہلے دس میں کیا گیا ہے۔ مناسب ہو گا آپ کو ان مضامین کا خلاصہ بتا دیا جائے تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ مرزا حماقت بیگ کو ایڈیٹوریل لکھنے میں کتنا کمال حاصل ہے۔

''میں نے عذاب پور میں کیا دیکھا؟'' انہوں نے قارئین کو بتایا ہے کہ جب انہوں نے عذاب پور جانے کا عزم کیا، ان کی بیوی اور ان کے بچوں نے رو رو کر درخواست کی خدا کے لیے

عذاب پور نہ جایئے، کیونکہ وہاں آج تک کوئی صحافی نہیں گیا اور اگر گیا ہے تو زندہ بچ کر نہیں آیا۔ ان کی بیگم نے تو یہاں تک کہہ دیا اگر آپ عذاب پور کی بجائے جہنم میں جا رہے ہوتے تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا۔

دوسرے مضمون میں انہوں نے عذاب پور کا حدود اربعہ بیان کیا ہے۔ عذاب پور ایک پہاڑی قصبہ ہے جس کی آبادی پچاس اشخاص پر مشتمل ہے۔ اس کے شمال میں سیلاب پور ہے۔ اس کو سیلاب پور اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں ہر سال سیلاب آیا کرتا ہے۔ کباب پور کا نام کبھی شراب پور ہوا کرتا تھا۔ مگر اس نام کو فضول سمجھ کر ترک کر دیا گیا۔ نواب پور میں کسی زمانہ میں نواب رہا کرتے تھے۔ مگر اس بات کا پتا نہیں چل سکا، وہ یہاں کیوں رہتے تھے۔ رباب پور میں ہر شخص رباب بجانے میں ماہر ہے۔ عذاب پور کو یہ نام کیوں دیا گیا، اس کے متعلق مورخوں میں اختلاف رائے ہے۔ کچھ کہتے ہیں، راجہ عذاب رائے کے نام پر قصبہ کا نام رکھا گیا۔ کچھ کی رائے میں عذاب ایک رقاصہ کا نام تھا، جو اس قصبہ میں رہا کرتی تھی اور جس کی وجہ سے اس کے عشاق کی جان عذاب میں تھی۔ کچھ اور کا خیال ہے جب اس قصبہ کے بسانے والوں کو کوئی اور نام نہ سوجھا انہوں نے عذاب پور رکھ دیا۔

تیسرے مضمون میں انہوں نے ایک خواب کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے عذاب پور جانے سے پہلے دیکھا تھا۔ اس خواب میں ایک جنگلی قبیلہ نے انہیں اپنا سردار منتخب کرنے کے بعد ان سے درخواست کی تھی وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دیں اور جنگل کی شہزادی سے شادی کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔

اس مضمون میں مرزا صاحب نے یہ واضح کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس خواب کا عذاب پور سے کیا تعلق۔

چوتھے مضمون میں انہوں نے چند حکایتیں بیان کی ہیں اور ان سے کچھ سبق آموز نتائج اخذ کیے ہیں۔ ایک کہانی ہے۔ ''چالاک اور بے وقوف لومڑی'' ایک کوے کے منہ میں گوشت کا ٹکڑا دیکھ کر لومڑی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے کوے کی تعریف کرتے ہوئے کہا، سنا ہے آپ بہت اچھا گاتے ہیں۔ کوے نے گوشت کا ٹکڑا کھانے کے بعد جواب دیا، آپ نے غلط سنا۔ بندہ تو صرف کائیں کائیں کرنا جانتا ہے۔

اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے، چالاک آدمی کی خوشامد نہیں کرنا چاہیے۔

ایک اور کہانی ہے کہ ایک شخص بچھڑے کی رسی ہاتھ میں پکڑ کر جا رہا تھا۔ اسے باری باری تین ٹھگ ملے۔ انہوں نے اسے بتایا وہ بچھڑے کو نہیں ایک بڑے قد کے کتے کو لیے جا رہا ہے۔ اس شخص نے کہا..... آپ تینوں کی بینائی کمزور ہو گئی ہے۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا، آپ فوراً عینک لگوا لیجیے۔

اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے بچھڑے پر کبھی کتے کا گمان نہیں کرنا چاہیے۔

پانچویں مضمون میں مرزا صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو ادب میں صرف ایک کام کا ناول، دو کام کے نقاد اور تین کام کے شاعر ہیں۔ ناول کا نام امراؤ جان ادا ہے۔ نقاد الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد ہیں اور شاعروں کے نام یہ ہیں۔ میر، غالب اور اقبال۔

مضمون نمبر چار کی طرح انہوں نے اس مضمون میں بھی وضاحت نہیں کی کہ اس مضمون کو جملہ معترضہ کی حیثیت کس لیے عطا کی گئی ہے۔

چھٹے مضمون میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ جب وہ عذاب پور میں داخل ہوئے، بہت سے لوگوں نے انہیں پاگل، سڑی اور دیوانہ سمجھا اور ان پر پتھر برسائے۔ کچھ منچلوں نے انہیں زنجیر پہنانے کی کوشش بھی کی، خوش قسمتی سے ان کے روزنامہ کے واحد گاہک منشی کنول نین نے انہیں پہچان لیا اور اپنے گھر لے گیا۔

ساتویں مضمون میں انہوں نے اس جاسوسی ناول کا ذکر کیا ہے، جو وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے اور جسے انہوں نے عذاب پور کی رومانی فضا میں مزے لے لے کر پڑھا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے آدھے ناول کی کہانی بھی درج کر دی ہے۔

آٹھویں مضمون میں ناول کے باقی حصے کی کہانی درج کی گئی ہے۔ نیز قارئین سے سفارش کی گئی ہے وہ یہ ناول ضرور خریدیں کیونکہ اس کے مصنف مرزا صاحب کے داماد ہیں۔ اگر نہ بھی ہوتے تب بھی یہ ناول اتنا ہی دلچسپ ہوتا جتنا اب ہے۔

نویں مضمون میں ان خطوط کا ذکر کیا گیا ہے جو مرزا صاحب نے قصبہ عذاب پور سے مختلف اشخاص کو لکھے۔ ان میں سے ایک خط ان کی محبوبہ کے نام ہے۔ اس میں انہوں نے تجویز پیش کی ہے، گو ہم دونوں شادی شدہ ہیں اور ہمارے چھ چھ بچے ہیں۔ لیکن اگر تم اپنے شوہر کو طلاق دے

دو تو میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کے لیے تیار ہوں۔

ایک اور خط ان کے بڑے لڑکے کے نام ہے۔ اس میں انہوں نے ایک حیرت انگیز انکشاف کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ عموماً لائق والدین کی اولاد نالائق اور نالائق والدین کی اولاد لائق ثابت ہوتی ہے۔ میں خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ میری اولاد لائق ثابت ہوگی"۔

دسویں مضمون میں انہوں نے اس بات کا اعتراف اور اعلان کیا ہے کہ قصبہ عذاب پور میں انہوں نے کچھ نہیں دیکھا کیونکہ اس قصبہ میں کوئی چیز دیکھنے کے قابل ہی نہیں۔

باقی دس مضامین پہلے دس مضامین کے موضوعات کو دہراتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اس تکرار کے لیے یہ جواز پیش کیا ہے۔

"ہمارا تجربہ ہے، قارئین کا حافظہ ضرورت سے زیادہ کمزور ہوتا ہے، اس لیے وہ جلد بھول جاتے ہیں کہ چند دن پہلے انہوں نے کیا پڑھا تھا۔ بالفرض محال، اگر ان کا حافظہ کمزور نہ بھی ہو تو موضوعات کو دہرانے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ ایسا کرنے سے وہ ذہن نشین ہو جاتے ہیں"۔

☆☆☆

کہاوتیں دھوکا دیتی ہیں

حسن نظر فریب کی طرح کہاوتیں بھی اکثر دھوکا دیتی ہیں۔ "میکاولی" نے ٹھیک کہا تھا۔ ہر کہاوت میں صرف پچاس فی صد صداقت ہوتی ہے۔ میکاولی کا یہ قول بھی ایک کہاوت ہے اور اس میں پچاس فیصد صداقت ہے۔ اب آپ اس صداقت کو ہی لیجئے۔ کاٹھ کی ہانڈی بار بار نہیں چڑھتی۔ ہمارا تو خیال ہے جب تک دنیا میں کاٹھ کے الو موجود ہیں، کاٹھ کی ہانڈی بار بار چڑھتی رہے گی۔ شرط صرف یہ ہے خانساماں ہوشیار ہونا چاہئے۔ یعنی اسے ہانڈی چڑھانے کا صحیح طریقہ آتا ہو۔ تجربہ شاہد ہے اگر ایسا ہو تو تیز آگ اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی، ہانڈی خانساماں کا نہیں۔ اگر واقعی کاٹھ کی ہانڈی بار بار نہ چڑھتی تو عیار اور دھوکے باز لوگ ایک آدھ بار دوسروں کو دھوکہ دینے کے بعد اپنے پیشے سے توبہ کر لیتے۔

ایک اور کہاوت ہے جو گرجتے ہیں برستے نہیں۔ خدا جانے یہ کہاوت کس شخص نے کون سے بادل دیکھ کر گھڑ دی تھی۔ کیونکہ ہم نے تو ہمیشہ دیکھا ہے کہ گرجنے والے ضرور برسا کرتے

ہیں، پھر جیسا کہ کسی لال بجھکڑ نے کہا ہے، یہ کون کہہ سکتا ہے، کب کوئی بادل گرجنا بند کر دے اور برسنا شروع کر دے۔ کچھ سادہ لوگ جو اس کہاوت میں یقین رکھتے ہیں، اگر بارش میں اس لیے بھیگتے ہوئے پائے گئے ہیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بادل صرف گرجتے رہیں گے برسیں گے نہیں اور اس کا تو آپ کو بھی تجربہ ہوگا۔ جب آپ کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہو جاتا ہے۔ وہ پہلے زور سے چیختی اور چلاتی ہے اور پھر آنسو بہانے لگتی ہے! صرف یہ مثال ہے اس کہاوت کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

آپ نے یہ مشہور کہاوت بھی ضرور سنی ہوگی۔ ماں پر پوت، پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ ہمیں تو اس کی صداقت میں بھی شک ہے۔ کیونکہ کچھ بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ماں پر جاتے ہیں نہ باپ پر یعنی جو صرف اپنے آپ پر جاتے ہیں اور آپ نے ایسے گھوڑے دیکھے ہوں گے جن کے باپ پر کسی گھوڑی کا نہیں خچر یا گدھے کا گمان ہوتا ہے۔ یعنی جو اڑیل اور بے وقوف ہوتے ہیں کہ انہیں از راہ اخلاق ہی گھوڑا کہا جا سکتا ہے۔ دراصل بچہ، ماں اور باپ میں سے کسی ایک پر جا سکتا ہے۔ ایک ایرانی شہزادے کی ایک ایسے نوجوان سے ملاقات ہوئی جس کی شکل ہو بہو اس سے ملتی تھی۔ شہزادے نے حیران ہو کر اس سے پوچھا۔

''کیا تمہاری ماں کبھی شاہی حرم میں تھی''۔ نوجوان نے مسکرا کر جواب دیا۔

''میری ماں تو نہیں لیکن میرا باپ شاہی حرم میں برسوں ملازم رہا ہے''۔

ایک کہاوت یہ بھی ہے گیدڑ کی جب موت آتی ہے وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ خدا جانے مرنے کے لیے گیدڑ کون شہر کا رخ کرتا ہے۔ کیونکہ آج تک نہ تو ہمارے اور نہ کسی اور شہر میں گیدڑ مرنے کا واقعہ یا سانحہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا، یا تو آج تک کسی گیدڑ کی موت ہی نہیں آئی یا اس نے شہر میں مرنے کی بجائے جنگل میں مرنا بہتر سمجھا اور یا یہ کہاوت سرے سے ہی غلط ہے!

اب ذرا آپ اس کہاوت پر غور کیجئے۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔ یہ کہاوت اس لیے دھوکا دیتی ہے کیونکہ اس کا مفہوم واضح نہیں۔ نیکی کرنے کے بعد کیا اس شخص کو دریا میں ڈالنا چاہیے، جس کے ساتھ نیکی کی گئی ہے یا اپنے آپ کو اور اگر نیکی ہی کو دریا میں ڈالنا ہے تو پھر کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔

فارسی کی ایک کہاوت ہے۔ اگر عیسیٰ کا گدھا مکے سے بھی ہو آئے، پھر بھی وہ گدھا ہی رہے گا۔ یہ مثل اس لیے دھوکا دیتی ہے کیونکہ اس میں صرف ایک خاص گدھے کا ذکر کیا گیا ہے، باقی گدھوں یا انسانوں کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ ہمارا تو تجربہ ہے ہزاروں انسان متبرک سے متبرک جگہ کی زیارت کرنے کے بعد بھی گدھے ہی رہتے ہیں۔ اس لیے صرف عیسیٰ کے گدھے کو معتوب کرنا زیادتی اور بے انصافی ہے۔

اسی طرح یہ کہاوت آپ نے سنی ہوگی۔ گدھا کیا جانے زعفران کا بھاؤ۔ یہ بھی ایک نہایت گمراہ کن کہاوت ہے۔ اگر گدھا زعفران کا بھاؤ نہیں جانتا تو اسے معاف کیا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ بیچارہ تو صرف گھاس کا بھاؤ جانتا ہے۔ لیکن آپ کو ہزاروں آدمی ایسے ملیں گے جو زعفران کا بھاؤ تو کجا زعفران تک کو نہیں جانتے۔ یعنی جن کے خیال میں زعفران کسی ایکٹریس یا کسی ملک کی راجدھانی کا نام ہے۔

ایک اور مشہور کہاوت ہے۔ نیم حکیم خطرۂ جان۔ اس کہاوت میں بھی صرف پچاس فیصد صداقت ہے۔ کیونکہ کئی بار سالم حکیم بھی خطرۂ جان ثابت ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ ایک شخص کا باپ بیمار ہو گیا۔ اس نے پہلے ایک نیم حکیم سے مشورہ کیا۔ اس نے علاج کرنے کے لیے پچاس روپے مانگے۔ وہ شخص یہ رقم ادا کرنے پر راضی نہ ہوا اور ایکسپرٹ یعنی ماہر کے پاس اپنے بیمار باپ کو لے گیا۔ ایکسپرٹ نے پانچ سو روپے بطور فیس وصول کرنے کے بعد مریض کا علاج شروع کر دیا۔ ایک ہفتہ کے بعد مریض کی موت ہو گئی۔ نیم حکیم کو جب اس بات کا پتا چلا، اس نے مرحوم کے بیٹے سے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ جو کام میں پچاس روپے میں کر دینے کو تیار تھا، وہ آپ نے پانچ سو روپے دے کر کروایا۔ اس پر بھی آپ عقل مند سمجھتے ہیں اپنے آپ کو۔

اگر آپ ایمان داری اور غیر جانبداری کے ساتھ کہاوتوں کا تجزیہ کریں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا، ان پر یہ کہاوت صادق آتی ہے۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔

مثال کے طور پر ان چند کہاوتوں کو لیجئے۔ کتے کو گھی ہضم نہیں ہوتا۔ ہم نے تو مریل سے مریل کتے کو گھی ہضم ہوتا دیکھا ہے۔ چور کے پیر۔ اگر اس کے پیر نہ ہوتے تو وہ چوری کر کے کس طرح بھاگ سکتا۔ سانچ کو آنچ نہیں۔ اگر واقعی نہ ہوتی تو ہر شخص دھرم پتر یدمسٹر یا راجہ

ہریش چندر: ماں کا کام پیار ا ہے چام پیار انہیں۔ اگر در اصل ایسا ہوتا تو نصف سے زیادہ ہندوستانی بیویوں کو طلاق اور ساٹھ فی صدی ایکٹریسوں کو ملازمت سے جواب مل جاتا۔

اپنا اپنا۔ غیر غیر۔ ان دنوں تو اپنوں سے اغیار اچھے ثابت ہو رہے ہیں۔ بقول شاعر

جنہیں ہم غیر سمجھتے تھے وہی مشکل میں کام آئے
بنایا تھا جنہیں اپنا وہ مار آستیں نکلے

☆☆☆

ہم نے ایک سرائے کا ادگھاٹن کیا

یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم ادگھاٹن کرنے کے لیے موزوں شخص ہیں کیونکہ پچاس اسکولوں، پچیس گوشالاؤں اور پندرہ یتیم خانوں کا ادگھاٹن کر چکے ہیں۔ ایک قصبہ کے لوگوں نے ہمیں ایک سرائے کا ادگھاٹن کرنے کی دعوت دی۔ ہمارا دگھاٹن کا ڈھونگ سب سے نرالا اور انوکھا ہے۔ عام طور پر ہم جس چیز کا ادگھاٹن کرتے ہیں، اس کے متعلق کچھ نہیں کہتے۔ مثلاً جب ہمیں ایک یتیم خانہ کا ادگھاٹن کرنے کا موقع ملا۔ ہم نے کہا۔

''بہنو اور بھائیو! آپ سب کو یہ جان کر خوشی ہوگی۔ اس سال آلو کی فصل اچھی ہوئی ہے۔ آلو ایک مکمل غذا ہے۔ لیکن اس میں وٹامن ''سی'' نہیں ہوتا۔ خیر اس کمی کی تلافی آلو کے بعد پیاز کھانے سے کی جاسکتی ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے اگر آلو گلا سڑا نہ ہو اسے نہ صرف خود کھا لینا چاہیے، بلکہ دوسروں کو بھی کھلانا چاہیے۔ شری کالو رام نے مجھے ایک دفعہ بتایا تھا۔ جو شخص آلو نہیں کھاتا وہ آلو اور کپالو میں تمیز نہیں کر سکتا۔ کچھ عورتوں کو آلو سے خوامخواہ کی ''الرجی'' ہوتی ہے۔ انہیں آلو بخارا کھانا چاہیے۔ میں آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس یتیم خانہ کا ادگھاٹن کرنے کا موقع دیا۔ مجھے بتایا گیا ہے یہ یتیم خانہ لالہ بالو مل نے اپنے دادا لالہ ٹالو مل کی یادگار میں بنایا ہے۔ میں بڑی خوشی سے اس کا ادگھاٹن کرتا ہوں۔

ادگھاٹن کے بعد کچھ لوگ یہ کہتے سنے گئے۔ بھلا آلو کا یتیم خانہ سے کیا تعلق ہے۔ یہ تو ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ والی بات ہوئی، لیکن ہم نے ان کی بات پر دھیان دینا مناسب نہ سمجھا اور نہ ہی سوچا آئندہ ادگھاٹن کرتے وقت احتیاط سے کام لیں گے۔

چنانچہ سرائے کا ادگھاٹن کرنے سے پہلے ہم نے کہا۔

''اعداد و شمار بتاتے ہیں، اس سال چوہوں کی تعداد میں پچاس فیصد اضافہ ہوا ہے۔ یہ ایک نہایت خطرناک صورت حال ہے۔ پچھلے سال چوہے فصل کا دس فی صد چٹ کر گئے تھے۔ اس سال پندرہ فیصد ہضم کر جائیں گے۔ اگر اسی رفتار سے بڑھتے رہے تو برسوں کے بعد ساری کی ساری فصل کھا جایا کریں گے۔ اس صورت میں ایسا بھیانک قحط پڑے گا جس میں چوہوں کے علاوہ کوئی جاندار زندہ نہ رہے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ چوہے خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں پر عمل کریں۔ اگر وہ تھوڑے بچے پیدا کریں گے تو جہاں انہیں کھانے کو زیادہ ملے گا، وہاں انسانوں کا بھی بھلا ہوگا۔ بصورت دیگر انہیں ختم کرنے کے لیے بلیاں پالی جائیں گی اور پھر بلیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے کتے اور کتوں کو مارنے کے لیے لکڑ بگا۔

سامعین میں سے کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

''لیکن چوہوں کا سرائے سے کیا تعلق ہے؟'' ہم نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ موضوع سے بھٹک گئے ہیں اور ہمیں سرائے کے متعلق بھی ایک آدھ جملہ کہہ دینا چاہیے تھا۔ فوراً پینترا بدلتے ہوئے کہا۔

بہنو اور بھائیو! ویسے تو یہ دنیا ہی سرائے ہے۔ ہم مسافروں کی طرح اس میں آتے ہیں اور کچھ عرصہ کے بعد چلے جاتے ہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے

عجب سرائے یہ فانی کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

اس شاعر کے علاوہ بھگت کبیر نے بھی کہا ہے کہ انسان کا جسم ایک سرائے کی طرح ہے۔ کبیر بڑے پہنچے ہوئے سنت تھے۔ ان کے دوہے بہت مشہور ہیں۔ ایک دفعہ وہ جلتی چتا کو دیکھ کر اداس ہو گئے تھے کیونکہ انہوں نے دیکھا تھا کہ بال گھاس کی طرح جل رہے ہیں، ہڈیاں لکڑی کی طرح جل رہی ہیں۔ کبیر کی رائے میں انسان پانی کا یک بلبلہ ہے، وہ اس صبح کے ستارے کی طرح ہے، جو سورج کے چڑھنے پر غائب ہو جاتا ہے۔ ایک اور دوہے میں کبیر فرماتے ہیں۔

سامعین میں سے کسی اور شخص نے کہا۔ چوہوں کے بعد بھگت، ''چوہوں کے بعد بھگت کبیر! بھالا یہ کیا تک ہے؟''

ہم ذرا چوکنے ہو گئے۔ ہمیں خیال آیا، اب موضوع بدل دینا چاہیے۔ ہم نے ذرا کھانس کر گلا صاف کیا اور تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ بہنو اور بھائیو! امریکہ میں ایک کامیاب سیاست دان اسے سمجھا جاتا ہے، جو لومڑ، بھیڑیے اور مگر مچھ کا مرکب ہو۔ یعنی لومڑ کی طرح چالاک اور بھیڑیے کی طرح سفاک ہو اور مگر مچھ کی طرح جھوٹے آنسو بہا سکے۔ برازیل میں ایک عاشق کے لیے ضروری ہے کہ وہ طوطے کی طرح طوطا چشم ہو اور کوے کی طرح ہر وقت کائیں کائیں کر سکتا ہو۔ ہمارے ملک میں اس شخص کو شاعر سمجھا جاتا ہے۔ جو رند بلانوش ہو۔ کھویا کھویا نظر آتا ہو اور بہکی بہکی باتیں کرتا ہو''۔

سامعین میں سے چند اشخاص نے ہمیں ٹوکتے ہوئے کہا

''کوئی کام کی بات کیجئے، یونہی بے پر کی مت اڑائیے''۔

ہم نے جوش میں آ کر زور سے میز پر مکا مارا۔ اس کے بعد مکا ہوا میں لہرایا اور اعتراض کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کل کے چھوکرے سمجھتے ہیں ہمیں ادگھاٹن کرنا نہیں آتا۔ ہم ان کی واقفیت کے لیے بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہماری ساری عمر ادگھاٹن کرنے میں گزری ہے۔ ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کوئی شخص ہم سے بہتر ادگھاٹن نہیں کر سکتا۔ پاکستان کے شاعر مجید لاہوری نے شاید ہمیں ہی پیش نظر رکھتے ہوئے یہ اشعار کہے تھے:

ریس کے گھوڑوں پہ بھی تقریر کر سکتا ہوں میں
اکبر و اقبال کی تفسیر کر سکتا ہوں میں
بات پھولوں کی ہو یا قومی ترانے کا بیاں
جاٹ ہو بارہ مسالے کی کہ ہو اردو زباں
کشتہ فولاد ہو، یا شربت دینار ہو
ہے ضروری سب پہ میری رائے کا اظہار ہو

سامعین نے تالیاں پیٹ کر ہماری حوصلہ افزائی کی۔ معترض دم بخود رہ گئے۔ ادگھاٹن کے اختتام پر ایک قصبہ کا ڈیپوٹیشن ہم سے ملا اور درخواست کی کہ ہم اگلے مہینے کی دس تاریخ کو ان کے قصبہ میں آ کر ایک شمشان ادگھاٹن کریں۔

☆☆☆

لغات جدید

آدمی۔ وہ جانور
جسے چڑیا گھر میں اس لیے نہیں
بھجوایا گیا مبادا باقی جانور اس کی صحبت میں رہ کر بگڑ جائیں۔

آئینہ۔ وہ خوشامدی جو ہر شخص سے کہتا ہے۔ "میں نے آپ جیسا خوبصورت شخص آج تک نہیں دیکھا"۔

آرٹ۔ وہ چیز جسے سو میں سے اسی آدمی بالکل نہیں سمجھتے اور باقی بیس جو اسے سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں۔

آرٹسٹ۔ وہ انسان جس کے سر کے بڑھے ہوئے بال اور لمبی اور بے ترتیب ڈاڑھی دیکھ کر خیال آتا ہے کہ جس شہر میں رہتا ہے، وہاں نائی کی دکان نہیں ہوگی۔

آمدنی۔ وہ کمائی جو آدھی ڈاکٹر اور آدھی محکمہ انکم ٹیکس لے جاتا ہے۔

آج کس کا منہ دیکھا ہے۔ جب صبح آئینہ
میں اپنا منہ دیکھنے کے بعد
سارا دن نقصان
ہی ہوتا رہے اس
وقت اس محاورہ کا استعمال کیا
جاتا ہے۔ ایک مرتبہ استاد ذوق کو اس قسم کی صورت حال سے دو چار ہونا پڑا تھا، چنانچہ انہوں نے فرمایا۔

جس جگہ بیٹھے ہیں بادیدہ نم اٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے اٹھے

آوے کا آوا بگڑا ہے۔ اپنے آنے والی نسل پر ایک نسل کا تبصرہ!

آپ کے سر کی قسم۔ دنیا کی سب سے جھوٹی اور بے ضرر قسم جس کے کھانے سے کھانے والے کا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔

داغ دہلوی اس نکتہ کو جانتے تھے۔ تبھی کہتے ہیں:

آپ گھبرائیں نہیں جور سے توبہ کریں
آپ کے سر کی قسم، داغ کا حال اچھا ہے

ادیب۔ وہ آدمی جو، ہوا، یا "واہ واہ" پر
پلتا پنپتا اور جیتا ہے۔
(2)۔ وہ شخص جو اس غلط فہمی میں مبتلا
ہے کہ شیکسپیئر، کالی داس
اور غالب کے بعد ادب کو فروغ دینے کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔

ایڈیٹر۔ وہ بدنصیب شخص جو ہر روز اس امید پر ایڈیٹوریل لکھتا ہے کہ شاید قارئین اسے پڑھیں گے، لیکن جس کی یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوتی۔
(2) وہ اخبار نویس جس کا ایڈیٹوریل اس کے علاوہ صرف ایک اور شخص پڑھتا ہے یعنی پروف ریڈر۔

امرود۔ اکبرالہ آبادی اور مہادیوی ورما کے بعد الہ آبادی ہندوستان کو تیسری دین؟

باپ۔ وہ گنجا اور تھکا ماندہ شخص جو سارے گھر کے لیے کماتا ہے لیکن جسے اس کی بیوی نکھٹو اور بچے چغد سمجھتے ہیں۔

بچے۔ چلتی پھرتی روتی پیٹتی لعنتیں جو جتنی کم ہوں زیادہ ہیں۔

بیوی۔ دھوبن، باورچن، ترس اور باندی کا قابل رحم مرکب!

بھابھی۔ سالی کے علاوہ واحد ہندوستانی عورت جس کے ساتھ تھوڑی سے بے تکلفی کے ساتھ پیش آیا جاسکتا ہے۔

برسات۔ وہ واہیات موسم جس میں اگر "فلو" نہ پھیلے تو ملیریا ضرور پھیلتا ہے۔

بھرتی کا شعر۔ آج کل لکھی جانے والی غزلوں کا قریب قریب ہر ایک شعر۔

بور۔ وہ شخص جس کی گفتگو سن کر سر پیٹنے کو جی چاہے، اپنا نہیں اس کا۔

بوسہ۔ شاذ و نادر پھول کی پتی لیکن اکثر و بیشتر جوتی کے تلوے چاٹنے کا فعل!

پیسہ۔ خدا کا سب سے بڑا حریف اور رقیب!

پڑوسی۔ وہ شخص جو آپ کو کمینہ سمجھتا ہے اور جسے آپ پہلے درجہ کا لچا اور بدمعاش سمجھتے ہیں۔

تکرار۔ وہ بحث جو دو بے وقوفوں میں اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے کی جاتی ہے کہ ان میں کون بڑا بے وقوف ہے۔

تشریف لے جانا۔ وہ عمل جو ''تشریف'' لانے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

تقریر۔ کچھ کہے بغیر متواتر بولتے چلے جانے کا فن۔

تان سین۔ آپ کے پڑوس میں رہنے والا وہ گویا جو پکا گانا گاتا نہیں، اس کی ٹانگ توڑتا ہے۔

تنخواہ۔ وہ چیز جس کے لیے مہینا بھر انتظار کرنا پڑتا ہے اور جو ایک دن میں ختم ہو جاتی ہے اور جس پر وصل کے دن کی طرح یہ شعر صادق آتا ہے۔

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

تفریح۔ دن رات اپنے ہمسایوں کے طور طریقوں میں مین میکھ نکالنا۔

جرنلسٹ۔ وہ شخص جو ایڈیسن اور مارکونی سے بڑا موجد ہے کیونکہ وہ عجیب وغریب ایجاد کرتا ہے جو تا۔ وہ چیز جسے چرانے کے لیے ہم مسجدوں اور مندروں میں جاتے ہیں۔

جوتشی۔ وہ آدمی جسے مستقبل کے متعلق اتنا ہی معلوم ہے جتنا آپ کو لیکن ہو اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

جگنو۔ وہ دانش ور جو بے تکی باتیں بنانے میں مہارت رکھتا ہے لیکن کبھی کبھی غلطی یا اتفاق سے کوئی چونکا دینے والی بات بھی کر سکتا ہے۔

جلوس۔ بہت سے سر پھروں کا مل کر گلیوں اور بازاروں میں چلنا اور چلانا!

جمہوریت۔ وہ طرز حکومت جس میں سرکار سمجھتی ہے کہ تمام مسائل حل کرنے کی ذمہ داری جنتا پر عائد ہوتی ہے اور جنتا سمجھتی ہے، گورنمنٹ پر عائد ہوتی ہے۔

حسد۔ ایک قسم کا شکوہ کہ جیسے دوسرے ہیں ویسا میں کیوں نہیں یا جیسا میں ہوں ویسے دوسرے کیوں نہیں۔

حاضر جواب۔ وہ گنہگار جس سے خدا پوچھے گا۔ ''تمہیں جہنم کیوں نہ بھجوایا جائے تاکہ دوسرے گنہگار عبرت پکڑیں''۔ تو جواب میں کہے گا۔ ''اے خداوند! گناہ تو میرے علاوہ بھی کئی لوگوں

نے کیے تو ان میں سے کسی ایک کو جہنم میں کیوں نہیں بھجوا تا تا کہ میں عبرت پکڑوں''۔ اور خدا اس کے جواب سے اتنا خوش ہوگا کہ اسے جنت میں بھجوا دے گا۔

دماغ۔ وہ بھوسہ جو اسی فیصد لوگوں کی کھوپڑیوں میں بھرا ہوتا ہے۔

دوست۔ وہ شخص جسے مخاطب کر کے کہا جا سکتا ہے

وہ ارمان جو نہ نکلے دشمنی سے
نکالے جا رہے ہیں دوستی سے

روزی۔ وہ چیز جو اگر خدا کی بجائے بندوں کو دیتا تو آدھے سے زیادہ لوگوں کو ہر روز، روزہ رکھنا پڑتا۔

راز۔ وہ بات جو ہم کسی شخص کو بتانے کے بعد اسے تاکید کرتے ہیں کہ کسی اور کو نہ بتائے۔ کیوں کہ جس شخص نے ہمیں یہ بات بتائی تھی، اس نے ہمیں یہی تاکید کی تھی۔

رتجگا۔ وہ شور و شغب جس کا اہتمام دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کی لیے نہیں، بلکہ ہمسایوں کی نیند حرام کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

زبان۔ گوشت کا لوتھڑا جس کی لمبائی گز بھر ہو سکتی ہے۔ اگر وہ عورت کے منہ میں ہو۔

شرم۔ وہ جو تمام حیوانوں میں سے کبھی صرف انسان کو آیا کرتی تھی مگر آج کل اسے بھی نہیں آتی۔

شیخ چلی۔ وہ سادہ لوح جو اس لیے جان باز نہ ہو سکا کہ اسے اصلی پلاؤ پکانے کی توفیق نہیں تھی اور خیالی پلاؤ سے پیٹ نہیں بھرتا۔

شاعر۔ وہ شخص جس کا تکیہ کلام ہوتا ہے۔ ''عرض کیا ہے'' اور جب وہ عرض کرنے پر آتا ہے تو عرض کیے چلا جاتا ہے۔

جدید شاعر۔ وہ شاعر جس کی شاعری نظم ہوتی ہے نہ نثر بلکہ بعض اوقات تو معما، پہیلی یا گورکھ دھندا تک نہیں ہوتی۔

صبر۔ بے بسی یا بے کسی کا پُروقار نام

عمل۔ وہ جس کے بغیر کوئی چیز نہیں بن سکتی۔ بقول مجید لاہوری۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
اس سے آدمی بنتا ہے اور آچار شلغم بھی

عشق۔ایک قسم کی خود فریبی جس میں مبتلا ہو کر ایک نوجوان کسی خاص لڑکی کو باقی تمام لڑکیوں سے حسین سمجھتا ہے۔

طالب علم۔ وہ نوجوان جو علم نہیں ڈگری کا طالب ہے اور جس کا مقولہ ہے مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔

فاختہ۔ایک پرندہ جسے کبھی خلیل خاں اڑایا کرتے تھے۔لیکن جوان کی وفات کے بعد خود اڑ رہی ہے۔

طنز۔ ''جاہل'' لفظ استعمال کئے بغیر کسی کو جاہل کہنا۔

ظریف۔ وہ شخص جو ہمیشہ کھری بات کہتا ہے لیکن لوگ سمجھتے ہیں مذاق کر رہا ہے۔

مجنون۔نجد کا رہنے والا ایک نوجوان جس کی آنکھ میں نقص تھا اور جس کو لیلیٰ جو بالکل کالی تھی گوری نظر آتی تھی۔

نابالغ۔ستر برس کا بوڑھا جو اختر شیرانی کی نظموں پر سر دھنتا ہے اور ریاض اور جلیل سن کر وجد میں آجاتا ہے۔

مشاعرہ۔شعر خوانی کی وہ مجلس جس میں شعرا اصرار کرتے ہیں کہ سامعین بار بار ''مکرر مکرر'' کی صدائیں بلند کریں اور سامعین اصرار کرتے ہیں کہ شعرا کوئی کام کا شعر پڑھیں اور جو اسی کش مکش میں ختم ہو جاتی ہے۔

گناہ بے لذت۔ مسجد یا مندر سے ایسا گھسا پٹا جوتا چرانا جسے مرمت کرنے کے بعد بھی پہنا نہیں جا سکتا۔

گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔نئی شاعری جس میں ایک مصرع کا ''وزن'' ایک ماشہ اور دوسرے کا ایک تولہ ہوتا ہے۔

لنگور۔ وہ جانور جسے دیکھ کر کوئی بھی انسان خدا کا شکر بجالاتا ہے کہ وہ اس سے کم بدصورت ہے اور اگر نہیں ہے تو کم از کم اس کی دم تو نہیں۔

نازک مسئلہ۔ وہ مسئلہ جو صنف نازک سے تعلق رکھتا ہو، چولی یا انگیا کا سائز!

نازک خیالی۔کوئی ایسی بے تکی بات جسے اگر آپ نظم کی بجائے نثر میں کہیں تو لوگ سمجھیں گے آپ بیٹھے بیٹھے پاگل ہو گئے ہیں۔

ہچکی۔ وہ آواز جو کسی کے یاد کرنے پر گلے سے رک رک کر نکلتی ہے اور اس وقت تک نکلتی رہتی

ہے جب تک عاشق کا دم نکل نہیں جاتا۔ سند کے لیے ملاحظہ فرمایئے۔ داغ دہلوی کا یہ شعر

مجھے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا
نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

ویرانہ۔ وہ بڑا شہر جس میں کوئی انسان نہ ہو، صرف آدمی ہی آدمی ہوں۔

وفا۔ وہ وصف جس کی ہم ہمیشہ دوسروں سے توقع کرتے ہیں۔

یار۔ وہ شخص جو سینے کی بجائے پیٹھ میں خنجر گھونپتا ہے۔

☆☆☆

ناچ میری بلبل

کل جب ہم شرما صاحب سے ملنے کے لیے ان کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ باتھ روم میں ہیں۔ ہم باتھ روم کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگے۔ وہ باتھ روم میں گنگنا رہے تھے۔

''ناچ میری بلبل..... ناچ میری بلبل'' ہمیں یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ بلبل گاتی ہے، یہ تو ہمیں معلوم تھا۔ لیکن وہ ناچتی بھی ہے، اس سے ہم بے خبر تھے۔ ہم نے سوچا شرما صاحب نے ایک ناچنے والی بلبل پالی ہے اور اب اس سے فرمائش کر رہے ہیں کہ وہ ناچے تاکہ غسل کرتے وقت ان کا دل لگا رہے۔ پھر خیال آیا، حالانکہ یہ خیال تھا؟ شاید ہماری بھابی صاحبہ سے ناچنے کی فرمائش کی جا رہی ہے اور پیار سے انہیں بلبل کہا جا رہا ہے۔ جب شرما صاحب غسل کرنے کے بعد ہمارے پاس آئے تو ہم نے ان سے سوال کیا۔

''یہ ناچنے والی بلبل آپ کہاں سے لے آئے؟'' انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''آپ کون سی ناچنے والی بلبل کی بات کر رہے ہیں؟''

وہی جس سے آپ باتھ روم میں ناچنے کے لیے کہہ رہے تھے''۔

انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولے۔ ''جناب وہ تو ایک فلمی گانا تھا جس کے بول ہیں۔ ناچ میری بلبل کہ پیسہ ملے گا''۔

''بڑے عجیب بول ہیں؟''۔

''عجیب تو ہیں ہی۔ ان فلمی گانے لکھنے والوں کو ہمیشہ بہت دور کی سوجھتی ہے۔ دیکھئے نا کیا بات پیدا کی ہے۔ ناچ میری بلبل کہ پیسہ ملے گا''۔

''ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ آپ کو فلمی گانے کیوں پسند ہیں''۔

''اور ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ آپ کو فلمی گانے کیوں پسند نہیں۔ حالانکہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں، بہت سے لوگ فلم گانوں کی خاطر دیکھتے ہیں۔ فلم کی کہانی چاہے بالکل بے تکی ہو لیکن اگر گانے اچھے ہوں تو وہ اس فلم کو پسند کرتے ہیں''۔

''وہ اس نوجوان کی طرح ہیں جو کسی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے کہ اس کے گال پر ایک تل ہے جو اسے اچھا لگتا ہے حالانکہ لڑکی بالکل بدصورت ہے''۔

''اور یہ تو آپ شاید جانتے ہی ہیں ہم ریڈیو پر صرف فرمائشی فلمی گانوں کا پروگرام سنتے ہیں''۔

''آپ باقی پروگرام کیوں نہیں سنتے''۔

''دیکھئے خبریں سننے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ تو اخبار میں پڑھی جا سکتی ہیں۔ بچوں کا پروگرام اتنا دقیق ہوتا ہے کہ اسے بچے تو کیا ان کے والدین تک سمجھ نہیں سکتے۔ عورتوں کے پروگرام میں ایسی بدمزہ ترکاریاں بنانے کی ترکیبیں بتائی جاتی ہیں جنہیں کھانے کے بعد شوہر بیوی سے کہتا ہے۔ ''خدا کے لیے کوئی اور سزا دے لیجئے، ایسی ترکاریاں مت بنایا کیجئے''۔ تقریریں اتنی خشک اور غیر دلچسپ ہوتی ہیں کہ انہیں سن کر وحشت ہونے لگتی ہے۔ لے دے کے فلمی گانے رہ جاتے ہیں۔ انہیں سن کر آنکھوں میں نور نہیں تو دل میں سرور ضرور پیدا ہوتا ہے۔ پھر مزے کی بات یہ ہے ان میں حیرت انگیز دانائی پائی جاتی ہے''۔

''دانائی؟ مجھے تو وہ سب ایک جیسے لگتے ہیں''۔

''یہی تو ان کی غلطی ہے۔ دیکھئے اگر شادی کے گانے ہیں، تو آپ کی دعا سے طلاق کے گانوں کی بھی کمی نہیں اور خدا جانے چاہا تو بہت جلد نس بندی کے گانے بھی معرض وجود میں آ جائیں گے۔ سنجیدہ گانوں کے ساتھ ساتھ مزاحیہ گانے ہیں اور پھر اداسی، حسرت اور یاس کے گانے تو اتنے دردناک ہیں کہ انہیں گنگناتے وقت خواہ مخواہ خودکشی کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔''

''لیکن یہ سب گانے نہایت سطحی اور اکثر عامیانہ یا بازاری ہوتے ہیں''۔ ہم نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

''آپ یہ اس لیے کہہ رہے ہیں، کیونکہ ایسا کہنا فیشن میں داخل ہے، ورنہ فلمی گانوں میں بڑے پتے کی باتیں کہی جاتی ہیں''۔

''پتے کی باتیں؟ بھلا اس گانے میں کیا پتے کی بات ہے؟''۔

دلہنیا لے جائیں گے دل والے''۔

''کمال ہے آپ یہ بھی نہیں سمجھ سکے بندہ پرور اس گیت میں بتایا گیا ہے کہ۔

ساقی کے ہاتھ ہے نہ کچھ قدر و قضا کے ہاتھ
ساغر اس کا ہے جو اٹھا لے بڑھا کے ہاتھ

دوسرے الفاظ میں یہ گیت انگریزی شاعر ڈرائیڈن کے اس قول کی تائید کرتا ہے جس میں کہا گیا ہے۔

''حسین عورت کو حاصل کرنے کے لیے شجاعت پہلی شرط ہے''۔

''چلئے یونہی سہی۔ لیکن یہ تو آپ تسلیم کریں گے بہت سے فلمی گیتوں کو صرف ان کی دھنوں کے لیے پسند کیا جاتا ہے ورنہ ان میں کچھ نہیں ہوتا''..... ''مثال کے طور پر؟''۔

ان گیتوں کے بول لیجئے۔

(1) ''زندگی اک سفر ہے سہانا کل کیا ہو کس نے جانا''۔

(2) ''زندگی خواب ہے، خواب میں جھوٹ کیا سچ کیا۔

(3) اور وہ گیت جو آپ باتھ روم میں گنگنا رہے تھے۔

''ناچ میری بلبل کہ پیسہ ملے گا''۔

دیکھئے صاحب پہلے گانے میں عمر خیام کے فلسفہ کو سمویا گیا ہے یعنی تلقین کی گئی ہے..... کھاؤ پیو اور موج کرو۔ ہوسکتا ہے کل تم جہان سے ہی گزر جاؤ۔ دوسرا گیت ویدانت کے فلسفے پر مبنی ہے جس کا مفہوم وہی ہے جسے گوسوامی تلسی داس نے اس دوہے میں بیان کیا ہے۔

اما کہوں میں انو بھو اپنا
مت ہری بھجن جگن سب سپنا

اب رہا تیسرا گیت یعنی ناچ میری بلبل کہ پیسہ ملے گا تو جناب من اس میں کارل مارکس کے فلسفہ کی تشریح کی گئی ہے۔ گیت کا مطلب ہے سرمایہ دار مزدور کو ننگی کا ناچ نچاتا ہے اور مزدور یہ

ناچ اس لیے ناچتا ہے کہ اسے پیسہ ملتا ہے۔ طوائف اپنا جسم اس لیے فروخت نہیں کرتی کیوں کہ وہ فطرتاً بدچلن ہے بلکہ اس لیے کہ اس کی مالی پریشانیاں اسے ایسے کرنے پر مجبور کرتی ہیں"۔

شرما صاحب سے فلمی گیتوں کی یہ دلچسپ تشریح سن کر ہم زیرلب مسکرائے۔ وہ سمجھے انہوں نے ہمیں قائل کر دیا ہے۔ جب ہم ان سے رخصت ہوئے تو فرمایا، آئندہ جب کبھی آپ کو دفتر میں زیادہ کام کرنا پڑے یا آپ کا باس آپ کو سخت سست کہے تو اسے یا اپنے آپ کو کوسنے کی بجائے گنگنایا کیجئے گا۔

ناچ میری بلبل کہ پیسہ ملے گا

☆☆☆

چار فن کار

پہلے فن کار نے کہا۔ "میری رائے میں ایک فن کار اور ایک نااہل آدمی میں کچھ فرق ہونا چاہیے۔ دراصل ایک فن کار کے لیے کچھ حد تک پاگل ہونا ضروری ہے۔ سب سے بڑا فن کار وہ ہوتا ہے جو ننانوے فیصد پاگل ہو۔ شکسپیئر نے کہا تھا "جہاں تک تخیل کا تعلق ہے ایک شاعر اور ایک پاگل میں کوئی فرق نہیں ہوتا"۔ میں جب تک فن کار نہیں تھا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کہا کرتا تھا۔ فن کار بننے کے بعد مجھے محسوس ہوا یہ میری غلطی تھی۔ دودھ یا پانی نام کی کوئی چیز نہیں، یہ سب نظر کا دھوکا ہے۔ اصل معنوں میں فن کار کہلانے کے لیے میں ان تمام چیزوں سے نفرت کرنے لگا جنہیں تمام سمجھ دار لوگ صدیوں سے پسند کرتے آئے ہیں۔ میں نے ادب کو ایک نیا نعرہ دیا۔ "ہر پرانی چیز اگر فرسودہ نہیں تو بیہودہ ضرور ہے اس لیے اسے ترک کر دینا چاہیے"۔ پچھلے دنوں کسی نے مجھ سے سوال کیا۔

"ہمالیہ، گنگا، تاج محل اور آسمان کے متعلق کیا خیال ہے"؟ میں نے جواب میں کہا۔ "یہ سب بوڑھے ہو گئے ہیں، اب انہیں ریٹائر ہو جانا چاہیے، اگر وہ ریٹائر ہونا نہ چاہیں تو ان کا بائیکاٹ کر دینا چاہیے"۔

"کیا سورج چاند اور ستارے بھی آپ کو اچھے نہیں لگتے"۔

"بالکل نہیں۔ اب ہمیں نئے چاند اور نئے ستاروں کی ضرورت ہے۔"

"مگر موجودہ سورج، چاند اور ستاروں میں کیا نقص ہے"؟

"نقص یہ ہے کہ یہ صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور جو چیز صدیوں سے چلی آ رہی ہو، وہ ضرور فضول ہوتی ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اب ہمیں ٹانگوں کی بجائے سر کے بل چلنا چاہیے، کیونکہ جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے ہم ٹانگوں پر چلتے آ رہے ہیں اور اسی طرح اب ہمیں ناک کی بجائے آنکھ سے چیزوں کو سونگھنا اور زبان کی بجائے کان سے چیزوں کو چکھنا چاہیے"۔

دوسرے فن کار نے پہلے کی تائید کرتے ہوئے فرمایا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں تو اپنی نانی کو بھی نانی تسلیم نہیں کرتا کیونکہ اب وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔ میں جب بھی اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں۔ سرد آہ بھر کے کہتا ہوں کاش وہ میری نانی نہ ہوتی۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میرے خیال میں اگر کوئی شخص عظیم شاعر بننا چاہتا ہے تو ضروری ہے وہ ایک لمبی ڈاڑھی کا مالک ہو۔ رابندر ناتھ ٹیگور اس لیے بڑے شاعر تھے کیونکہ ان کی ڈاڑھی بہت لمبی تھی۔ ٹینی سن کی ڈاڑھی ٹیگور کی ڈاڑھی سے بھی کچھ لمبی تھی۔ ڈاڑھی خدا کا نور ہی نہیں بلکہ ذہانت کی بھی علامت ہے۔ کچھ بے سمجھ لوگ کہتے ہیں شعر تو شاعر کہتے ہیں ڈاڑھی تو نہیں کہتی۔ وہ ان شاعروں کی مثالیں بھی دیتے ہیں جن کی ڈاڑھی نہیں تھی۔ خاص طور پر وہ اقبال اور فراق گورکھ پوری کا حوالہ دیتے ہیں۔ میں ان سے صرف یہی کہوں گا۔ اگر اقبال اور فراق کی ڈاڑھی ہوتی وہ عظیم کی بجائے عظیم تر شعرا ہوتے۔ ڈاڑھی صرف شاعروں کے کام کی چیز نہیں، ڈرامانٹسٹ اور ناولسٹ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جیسے کہ جارج برنارڈ شا اور چارلز ڈکنس نے اٹھایا۔ دراصل جب سے فنکاروں نے ڈاڑھی سے منہ موڑا ہے۔ وہ روبہ تنزل ہیں۔ شکر کا مقام ہے آج کل ڈاڑھی کو پھر فروغ حاصل ہو رہا ہے، چاہے اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ بلیڈ مہنگے ہو گئے ہیں۔ تاہم یہ نیک فال ہے۔ جو اشخاص محروم ہیں جسے چھوکرے یا عورتیں، انہیں چاہیے لکھتے وقت ڈاڑھی لگا لیا کریں۔ انہیں محسوس ہو گا کہ یک لخت انہیں نئے نئے خیال سوجھنے لگے ہیں اور وہ شاہکاروں کی تخلیق کرنے لگے ہیں"۔

تیسرے فن کار نے دوسرے سے اتفاق کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا۔ ڈاڑھی رکھنے کے علاوہ ایک فن کار کو رندِ بلانوش بھی ہونا چاہیے۔ اگر اس کے پاس شراب خریدنے کے لیے پیسے نہ ہوں تو اسے غالب کی طرح قرض کی مے پینے سے احتراز نہیں کرنا چاہیے۔ غالب

اس لیے غالب تھے کہ ہر شب اتنی شراب پیا کرتے جتنی انہیں میسر آتی تھی۔ اگر وہ شراب کی بجائے لسی یا شربت پی کر شعر کہا کرتے تو ان کے شعروں میں وہ تیکھا پن نہ ہوتا، جواب ہے۔ یورپ کے مصنفوں کی کامیابی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کی شراب پیتے ہیں۔ ہمارے شعرا کو اول تو شراب ملتی نہیں ہے۔ ملتی ہے تو اتنی تھرڈ ریٹ کہ اسے پی کر تھرڈ ریٹ اشعار ہی کہے جا سکتے ہیں۔ ہمارے شعرا اور بیشتر اوباش پانی پی کر غزلیں کہتے ہیں۔ ظاہر ہے پانی پی کر کسی کو کوسا تو جا سکتا ہے، لیکن اچھی غزل کی تخلیق نہیں کی جا سکتی یا زیادہ سے زیادہ ایسی غزل کہی جا سکتی ہے جسے پڑھ کر قارئین پانی پانی ہو جائیں۔ شراب اور شاعر میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہی وجہ ہے شراب کا تصور کرتے ہی شاعر دور کی کوڑی لانے لگتا ہے۔ حافظ، عمر خیام، غالب، جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی کی شاعری کو چار چاند لگانے والی اگر کوئی چیز تھی تو وہ شراب ہی تھی۔ اختر شیرانی تو شراب کے اتنے دلدادہ تھے کہ ہر پندرہ منٹ کے بعد یہ نعرہ لگاتے۔

غم زمانہ نہیں، اک عذاب ہے ساقی
شراب لا میری حالت خراب ہے ساقی

جگر مرادآبادی نے ایک دفعہ کہا تھا۔

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

ان کے شعروں نے سب کو اس لیے مارا کیونکہ وہ شراب پینے کے بعد لکھے گئے تھے۔ یہ صحیح ہے۔ شراب نے آخر انہیں مار ڈالا لیکن انہیں مرنا تو آخر تھا ہی۔ شراب نہ مار ڈالتی کوئی اور چیز جان لیوا ثابت ہوتی۔ آپ کہیں گے اگر شراب پی کر ہر شخص شاعر بن سکتا ہے تو پھر ہر شرابی شاعر کیوں نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے، شراب پینے کے بعد وہ شعر کہنے کی کوشش نہیں کرتا، واہی تباہی بکنے لگتا ہے یا بالکل خاموش ہو جاتا ہے"۔

چوتھا فن کار بولا۔ ڈاڑھی اور شراب اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ لیکن جب تک فن کار آوارہ گرد نہ ہو، وہ اعلیٰ درجے کا ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ ادب کے لیے خام مواد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاؤں میں چکر ہو۔ چنانچہ اگر وہ آج دہلی میں ہے تو کل لکھنؤ میں اور پرسوں کلکتہ میں۔ آزادی کے ساتھ آوارہ گردی کرنے کے لیے اسے شادی نہیں کرنا چاہیے اور

اگر غلطی سے کرے تو فوراً بیوی کو طلاق دے دینی چاہیے۔ اصل میں بیوی اور بچے ایک ادیب کے لیے سنگِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسے جونہی کوئی نیا خیال سوجھتا ہے وہ کوئی فضول بات یا فرمائش کر کے ان کا سارا مزہ کرکرا کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ سوچ رہا ہوتا ہے محبوب کی آنکھوں کو کس چیز سے تشبیہ دی جائے کہ لوگ پھڑک اٹھیں۔ اتنے میں اس کی بیوی چلا کر کہتی ہے۔ ''ابھی سنتے ہو۔ میرے سینڈل کا سٹریپ پھر ٹوٹ گیا ہے۔ کسی موچی سے نیا سٹریپ ڈلوا لائیے''۔ یا بچہ چیخ کر کہتا ہے۔ ''اب پیٹ میں درد پھر شروع ہو گیا ہے''۔ ادیب کے لیے یہ بھی لازمی ہے وہ طرح طرح کی عورتوں سے عشق کرے تاکہ عورت کی نفسیات کو سمجھ سکے۔ فرانس اور امریکہ میں کوئی ادیب اس وقت تک ناول لکھنے کی جرات نہیں کرتا جب تک وہ پندرہ بیس خوبصورت عورتوں سے عشق نہیں کرتا۔ ہمارے ادبا خیالی محبوبوں سے عالمِ تصور میں محبت کرنے کے بعد غزلیں کہتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں، بات نہیں بنی۔ بات بن بھی کس طرح سکتی ہے۔ جب سرے سے انہوں نے خوبصورت عورت ہی نہیں دیکھی۔ ان میں جو ذرا چالاک ہوتے ہیں۔ وہ ''انگور کھٹے ہیں''۔ کے مصداق محبت سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے اس قسم کے شعر کہتے ہیں۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

☆☆☆

لغات جدید تر

آنکھیں۔ وہ جو اگر آ جائیں تو زحمت، چلی جائیں تو مصیبت، لڑ جائیں تو آفت اور لڑائی جائیں تو قیامت ہوتی ہیں۔

آہ۔ وہ آنسو جو بھاپ میں تبدیل ہو گیا ہے۔

آدمی۔ دو ٹانگوں والا جانور جو لومڑ سے زیادہ مکار، بھیڑیئے سے زیادہ خونخوار اور بیشتر جانوروں سے زیادہ ناہنجار ہوتا ہے۔

(2) دم اور سینگ کے بغیر ایک مخلوق جو فرشتہ بن سکتی تھی، لیکن انسان کبھی نہ بن سکی۔

آنسو۔ جنہیں بہائے بغیر نہ عشق کیا جا سکتا ہے، اور تم تم ماتم پرسی۔
آسمان۔ وہ ظالم جو شعراء عشاق اور غربا کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔
آرام۔ وہ نایاب چیز جسے حاصل کرنے کے انسان خودکشی تک کر لیتا ہے۔
انگڑائی۔ التفات کی تمہید۔
(2) ایک ادا جو خاموشی کی زبان میں بہت کچھ کہہ جاتی ہے۔
استاد۔ وہ شخص جو عموماً شاگرد سے عقل میں نہیں صرف عمر میں بڑا ہوتا ہے۔
اخبار۔ وحشت ناک خبروں کی فہرست جسے پڑھ کر انسان سوچتا ہے، یا اللہ یہ دنیا کدھر جا رہی ہے۔
اخلاق۔ وہ کمزوری جس کے باعث آپ اندھے کو اندھا، کانے کو کانا، اور الو کو الو نہیں کہہ سکتے۔
امید۔ خود فریبی کا دوسرا نام۔
احسان۔ جو اگر کسی پر کیا جائے تو وہ آپ کو ساری عمر معاف نہیں کرتا۔
بہار۔ وہ موسم جس میں پھول کھلتے ہیں اور محکمہ انکم ٹیکس کا نوٹس آتا ہے کہ پچھلے سال کا انکم ٹیکس سرکاری خزانے میں فوراً داخل کرایئے۔
بے حیائی۔ فضول کام کرنے پر کوئی کتنا ہی لعن طعن کرے پروانہ کرنا، بلکہ یہ کہنا:

کیا ہوا لوگ اگر ہم کو گدھا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

(2) ٹھکرائے جانے کے باوجود پھر اس شخص کے پاس لوٹ آنا جس نے ٹھکرایا تھا اور کہنا۔

شاید مجھے نکال کر پچھتا رہے ہیں آپ
محفل میں اس خیال سے آ گیا ہوں

بکواس۔ آپ کی نگاہ میں آپ کے رقیب کی تحریریں اور تقریریں۔
بادشاہ۔ وہ سر پھرا جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی شخص حکومت کرنے کا اہل نہیں۔
بندر۔ وہ مخلوق جس پر اگر خدا تھوڑی سی محنت کرتا تو وہ انسان سے بہتر ثابت ہوتی۔
باورچی۔ وہ شخص جس کا آرٹ اس میں مضمر ہوتا ہے کہ ایک دن سالن میں نمک ضرورت سے

زیادہ اور دوسرے دن ضرورت سے کم ہونا چاہیے۔

پارسا۔ایک قسم کا لائسنس یافتہ ریاکار۔

پیار۔ہوس کا نہایت خوبصورت اور شاعرانہ نام!

پیغامبر۔وہ شخص جو ثابت خط لے کر محبوب کے پاس جاتا ہے اور خط کے ٹکڑے واپس لاتا ہے۔

تغافل۔ایک سزا جو جفا سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔

توبہ۔وہ عہد جسے کرنے کے بعد بہانے تلاش کیے جاتے ہیں کہ اسے کس طرح روڑا جائے۔

تکلف۔ایک رواج جسے ان دنوں گرانی کے باعث ترک کر دیا گیا۔

توند۔کسی سیٹھ کا پیٹ جو دائی ہی سے نہیں کسی سے بھی چھپایا نہیں جا سکتا۔

جنگ۔وہ خطرناک کھیل جو اپنے آپ اور دوسروں کو تباہ کرنے کے لیے کھیلا جاتا ہے اور جسے ایک بار کھیلنے کے بعد عزم کیا جاتا ہے کہ اسے پھر نہیں کھیلیں گے۔مگر جسے کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ کھیلا جاتا ہے۔

جنت۔کبھی سسرال یا کشمیر کو کہتے تھے، آج کل کنیڈا کو کہتے ہیں۔

جوانی۔عمر کا وہ حصہ جب آدمی کو خود پرستی کے دورے پڑتے ہیں۔

جنوں۔جن میں کبھی صرف عشاق مبتلا ہوا کرتے تھے مگر جس میں آج کل قریب قریب ہر نوجوان مبتلا ہے۔

جفا۔وہ جو اگر کی جاتی ہے تو عشاق شکوہ کرتے ہیں کہ کیوں کی جاتی تو کہتے ہیں۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

حیا۔پرانے زمانے کا ایک فیشن جو آج کل فیشن سے خارج ہے۔

خزاں۔وہ موسم جس میں بار بار خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے۔

خدا۔انسان کی وہ دلچسپ اور کارآمد ایجاد جسے کسی وقت بھی اپنی کم ہستی اور ناکامی کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

دوست۔(1) وہ شخص جو ہمارے کھلم کھلا نہیں چھپ کر وار کرتا ہے۔

(2) حسد، ہمدردی، نفرت اور محبت کا عجیب و غریب مرکب!

دل۔ جس کا آنا یا جانا ہر دو لعنت ہے۔

دعا۔ بے بس انسان کا آخری سہارا جو اکثر بودا ثابت ہوتا ہے۔

رقیب۔ وہ شخص جو اس محبوبہ سے عشق کرنے کا اہل نہیں جسے آپ چاہتے ہیں۔

رند۔ وہ عجیب و غریب شخص جو آگ کو پانی سمجھ کر پی جاتا ہے۔

زندگی۔ ایک گورکھ دھندا جس کی تخلیق کرنے کے بعد خدا خود حیران ہے کہ اسے کس طرح سلجھائے۔

زاہد۔ وہ شخص جس کا شغل ہی نہیں، پیشہ بھی رنگ میں بھنگ ڈالنا ہوتا ہے۔

سادگی۔ اپنی کھال اتروا کر سمجھنا شاید اس میں بھی میرا ہی بھلا ہے۔

(2) یک لخت امیر بن جانے کے بعد پرانے دوستوں سے ملاقات ہونے پر کہنا۔ ''آپ کو کہیں دیکھا ہے''۔

ساقی۔ مے خانے کا ایک کردار جس کا ذکر صرف کتابوں میں ملتا ہے، شام کا بھولا صبح گھر آئے۔ تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ بلکہ یہ پوچھتے ہیں۔ آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں؟

صبر۔ مجبوری اور بے بسی کا ایک اور نام۔

صیاد۔ وہ بیہودہ شخص جسے خندہ کی بجائے گریہ پسند ہے۔

عبادت۔ وہ فعل جس سے خدا کے علاوہ اپنے آپ کو دھوکا دیا جاتا ہے۔

غالب۔ وہ بدنصیب شاعر جسے اپنی وفات کے ایک سو سال بعد مقبرہ نصیب ہوا۔

فلسفہ۔ کوئی ایسی بات جو نہ اس کی سمجھ میں آتی ہے، جو اسے سمجھا رہا ہے اور نہ اس کی سمجھ میں آتی ہے جو اسے سمجھ رہا ہے۔ مگر جس کو پھر بھی پتے کی بات کہا جاتا ہے۔

فریاد۔ ایک دردناک صدا جو عموماً صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے۔

قفس۔ زندگی، شادی اور دفتر کا ایک ہم معنی لفظ۔

کانفرنس۔ دانش مندی کی وہ مجلس جو یہ طے کرنے کے لیے بلائی جاتی ہے کہ فلاں مسئلہ کا کیا حل ہے اور جو منتشر ہوتے وقت اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔

کام چور۔ ہر ساس کی نگاہ میں اس کی بہو، ہر بہو کی نگاہ میں اس کی ساس۔

کمر۔ وہ جو ہوتی تو ہے، مگر نظر نہیں آتی، کیونکہ شاعر کی آنکھ میں نقص ہوتا ہے۔

گھنٹہ گھر۔ وہ منار جس پر ایسی گھڑی لگی ہوتی ہے جو عموماً بند رہتی ہے یا غلط وقت بتاتی ہے۔

گرم ہونا۔ خاوند پر اس طرح برسنا کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے۔
سند کے لیے ملاحظہ فرمایئے۔ یہ شعر

خوب بھڑکایا تھا اس کو سوت نے
میں ہوئی جب گرم وہ ٹھنڈا ہو گیا

لب۔ جو اگر شیریں ہوں تو گالیاں کھانے کو جی چاہتا ہے۔
مالیخولیا۔ وہ دماغی مرض جس میں قریب قریب ہر بڑا افسر مبتلا ہوتا ہے۔
موت۔ جب بھی آئے معلوم ہوتا ہے وقت سے پہلے آئی ہے۔
مسخرہ۔ وہ شخص جو نقاب کو نقاب سمجھتا ہے، چہرہ نہیں سمجھتا۔
نواب۔ کسی بھی لکھنؤ کی اکہ والے یا رکشا والے کا دادا یا پردادا۔
ناصح۔ ایک قسم کا بور جس سے الرجی ہوتی ہے۔
نیند۔ جو جب اڑ جاتی ہے تو کسی طرح پکڑی نہیں جاتی۔
وفا۔ ایک خوبی جو انسان کی بجائے کتے میں پائی جاتی ہے۔
وصل۔ وہ مسرت جس کا تصور اس سے بہتر ہوتا ہے۔
ہما۔ ایک پرندہ جس نے اس لیے خودکشی کر لی کہ اگر اب وہ کسی شخص کے سر سے گزر جائے تو وہ بادشاہ نہیں بنتا کیونکہ بادشاہوں کا زمانہ لد گیا۔
یاس۔ وہ کیفیت جس میں ہم متواتر اس دروازے کی طرف دیکھتے ہیں، جو بند ہو گیا ہے، ان دروازوں کی طرف نہیں دیکھتے جو کھل گئے ہیں۔
یاد۔ گڑے مردے اکھیڑنے کی عادت یا مرض۔

☆☆☆

اپنے ہمسائے سے

آؤ میاں سمجھوتا کر لیں۔ آج تک ہم ایک دوسرے پر رعب جمانے کے لیے ایسی باتیں اور حرکتیں کرتے رہے ہیں، جنہیں فضول ہی نہیں مضحکہ خیز کہا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ہم کب تک ایک دوسرے کو محض مرعوب کرنے کے لیے اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتے

رہیں گے یا جھوٹ بول کر اپنی عاقبت خراب کیا کریں گے۔ کیوں نہ ہم اس حقیقت کو تقسیم کر لیں۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی رئیس ابن رئیس نہیں بلکہ تم ایک معمولی تاجر ہو اور میں ایک معمولی معلم ہوں اور دونوں پچھلے پانچ برس سے ایک دوسرے کو دھوکا دینے کی بیکار کوشش کر رہے۔ چنانچہ اگر تم کہتے ہو تمہارا بھائی دہلی میں مجسٹریٹ ہے تو میں تمہیں مطلع کرتا ہوں میرا بھائی الہ آباد میں ہائی کورٹ کا جج ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے تمہارا بھائی کسی مجسٹریٹ کا چپراسی ہے اور میرا کوئی بھائی ہی نہیں کیونکہ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔

دو سال ہوئے تم نے کہا تھا۔ میں بیوی اور بچوں کے ساتھ کسی صحت افزا مقام غالباً ''نینی تال'' جا رہا ہوں۔ اور میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں بھی بمعہ اہل و عیال اوٹا کمنڈ جا رہا ہوں۔ لیکن نہ تم نینی تال گئے اور نہ میں اوٹا کمنڈ۔ تم نے وہاں نہ جانے کا یہ بہانا ڈھونڈا کہ یک لخت تمہاری بیوی کی طبیعت خراب ہوگئی اور ڈاکٹر نے اسے گھر پر مکمل آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔ میں نے اوٹا کمنڈ نہ جانے کی یہ وجہ بتائی کہ میرے سالے کی شادی ہے اور مجھے اس کا انتظام کرنا ہے۔ لطف یہ ہے کہ مجھے معلوم تھا تمہاری بیوی بھلی چنگی ہے اور تمہیں پتا تھا میرے سالے کی شادی تو کیا ابھی سگائی تک نہیں ہوئی۔ پچھلے دنوں جب تم نے مجھ پر رعب جمانے کے لیے قسطوں پر ایک فریج خریدا تو میری بیوی میرے سر ہوگئی کہ ہمارے گھر فریج ضرور ہونا چاہیے۔ چنانچہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے فریج خریدنا پڑا۔ اب سنا ہے تم قسطوں پر ٹیلی ویژن سیٹ خریدنا چاہتے ہو۔ خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ فریج کی قسط بھی بڑی مشکل سے ادا کرتا ہوں اور اگر ٹیلی ویژن کی قسط بھی ادا کرنی پڑی تو دیوالیہ پٹ جائے گا۔ میں جانتا ہوں کم و بیش تمہارا بھی یہی حال ہے۔ یعنی بقول شعر

تم مسکرا رہے ہو مگر جانتا ہوں میں
بہتر تمہارا حال نہیں میرے حال سے

یہ دوسری بات ہے کہ تم کھلے بندوں کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کرو گے کہ ہم دونوں ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں۔

کبھی کبھی تم میرا قافیہ تنگ کرنے کی خاطر اپنی بیوی کے لیے قیمتی ساڑھی یا زیور لے آتے ہو۔ اسے پہن کر جب تمہاری بیوی شیخی بگھارتی ہے، یہ ساڑھی پانچ سو میں آئی ہے، یہ زیور دو ہزار

روپے کا ہے تو میری بیوی کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں اور وہ جلدی سے فرمائش کرنے لگتی ہے کہ اس سے قیمتی ساڑھی یا زیور لائیے نہیں تو مجھے کھانا ہضم نہیں ہوگا اور نہ ہی نیند آئے گی!

گذشتہ اتوار کو تمہاری بیوی نے اپنے بچے کے جنم دن کے موقع پر پچیس عورتوں کو مدعو کیا۔ اب میری بیوی کا تقاضا ہے کہ دو ہفتوں کے بعد جب اپنے بچے کا جنم دن منائے تو کم از کم پچاس عورتوں کو دعوت دے ورنہ ہمسائی کی نظر سے گر جائے گی۔

ہر بات میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی تمنا یہ رنگ لائی ہے کہ اب بیماریوں کے معاملے میں بھی ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ میری بیوی کہتی ہے۔ کل رات منے کو 104 ڈگری بخار تھا۔ بیچارہ ساری رات ہائے ہائے کرتا رہا۔ تو تمہاری بیوی فوراً منہ بنا کر جواب دیتی ہے۔ 104 ڈگری بخار بھی کوئی بخار ہوتا ہے۔ تین دن ہوئے ہماری بڑی منی بیمار پڑ گئی تھرمامیٹر لگایا تو معلوم ہوا 106 ڈگری بخار ہے۔ وہ چھ گھنٹے بیمار پڑی رہی لیکن میں ذرا بھی نہیں گھبرائی۔ ڈاکٹر تک کو ٹیلیفون نہیں کیا۔ سوچا بخار ہی تو ہے خود بخود اتر جائے گا..... ایک دن تمہاری اور میری بیوی اس موضوع پر بحث کر رہی تھی کہ سوتے وقت تم زیادہ زور سے خراٹے لیتے ہو یا میں۔ تمہاری بیوی کہہ رہی تھی وہ جب خراٹے لیتے ہیں تو ان کے خراٹوں کی آواز ایک فرلانگ سے سنی جاتی ہے۔ میری بیوی اسے بتا رہی تھی ہمارا صاحب جب خراٹے لیتا ہے تو اس کے خراٹوں کی آواز سول ہسپتال میں سنائی دیتی ہے۔ کئی بار ڈاکٹر ہمارے گھر یہ پوچھنے کے لیے آتے ہیں کہ خیریت تو ہے؟

ہماری بیویوں کی دیکھا دیکھی ہماری بچے بھی لاف زنی کی عادت کا شکار ہو گئے ہیں۔ اگر تمہارا بچہ کہتا ہے مجھے ہر روز دو روپے بطور جیب خرچ ملتے ہیں تو میرا بچہ اس کی بات کا مذاق اڑاتے ہوئے جواب دیتا ہے اونہہ صرف دو روپے ہمیں تو ہر روز پانچ روپیہ ملتے ہیں۔ اگر تمہارا بچہ کہتا ہے میرے ڈیڈی کے پیٹ میں گڑ بڑ رہتی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس کے پیٹ میں لمبے لمبے کیڑے ہیں۔ تو میرا بچہ اس کو مات دینے کے لیے فوراً یہ کہانی گھڑتا ہے۔ تمہارے ڈیڈی کے پیٹ میں صرف کیڑے ہیں۔ ہمارے ڈیڈی کے پیٹ میں لمبے لمبے سانپ ہیں۔ اگر تمہارا بڑا لڑکا کہتا ہے۔ میرے باپ نے ایک دفعہ مٹی کا تیل بلیک مارکیٹ میں فروخت کر کے سات ہزار روپے کمائے تھے۔ تو میرا لڑکا اس سے بازی لے گیا۔ رعب

ڈالنے کی نیت سے اسے بتاتا ہے۔ میرے ڈیڈی نے ایک مرتبہ سکول کے فنڈ سے دس ہزار روپے اڑائے تھے۔

صورت حال اتنی نازک ہوگئی ہے کہ ڈر لگتا ہے کہ کسی دن ہم دونوں اپنے بچوں یا بیویوں کے بیانات کی بنا پر گرفتار نہ کر لیے جائیں۔ اس لیے جاؤ آج سے سمجھوتا کر لیں کہ آئندہ نہ ہم اور نہ ہماری بیویاں اور نہ بچے ایک دوسرے پر رعب ڈالنے کی کوشش کریں گے بلکہ بڑی شرافت کے ساتھ تسلیم کر لیں گے کہ ہم دونوں معمولی حیثیت کے آدمی ہیں اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم رئیس ہیں تو ایک دوسرے کو نہیں صرف اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔

☆☆☆

فضول صاحب.....اور.....ان کے تلامذہ

''ہر شخص شاعر بن سکتا ہے''..... یہ عنوان ہے ہمارے اس اشتہار کا جسے آپ اکثر اخبار میں پڑھتے ہیں اور پڑھنے کے بعد سوچتے ہیں..... ناممکن! شاعری تو خدا کی دین ہے۔ بھلا ہر شخص کیسے شاعر بن سکتا ہے۔ جب بیشتر اشخاص ایک مصرع موزوں کرنا تو کجا ایک صحیح فقرہ تک نہیں لکھ سکتے۔ شاعری بچوں کا کھیل نہیں۔ اگر ہوتی تو میر ایسے قادر الکلام شاعر کو یہ کہنا نہ پڑتا۔

مصرع کوئی کوئی کبھی کبھی موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن ہم ہر شخص کو میر تقی میر بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ثبوت اس بات کا یہ ہے کہ اس وقت ہمارے ایک ہزار کے قریب شاگرد ہیں جن میں سے کم از کم ڈیڑھ سو کو استاد تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے شاگردوں کی پہچان یہ ہے وہ اپنے تخلص کے ساتھ ''فضولی'' ضرور لکھتے ہیں۔ جیسے بیمار فضولی، مکار فضولی وغیرہ وغیرہ۔ یاد رہے ہمارا تخلص فضول ہے اور اس رعایت سے ہمارے شاگرد فضولی کہلاتے ہیں۔

شاید آپ پوچھنا چاہیں گے، کیا ہم نے شاعری سکھانے کا کوئی اسکول یا کالج کھول رکھا ہے، جس کے ہم بیک وقت چپراسی، پروفیسر اور پرنسپل ہیں؟ جی نہیں۔ ہم تو صرف اخبار میں اشتہار دیا کرتے ہیں۔ اگر اخبار غور سے پڑھتے ہیں تو آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔ انسانی

نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پرائمری اور مڈل اسکولوں میں کام کرنے والے مدرس، میٹرک پاس کلرک اور بینکوں اور ڈاک خانوں کے وہ ملازمین جنھیں کسی وجہ سے بہتر گریڈ نہیں مل سکا، شاعر بننے کی خواہش مند ہوتے ہیں۔ بس یہی ہمارے طلبہ یعنی گاہک ہیں۔ قریب قریب یہ سب احساس کمتری کے شکار ہوتے ہیں جس کی تلافی وہ شاعر بن کر کیا کرتے ہیں۔

چنانچہ ان میں سے جب کسی کو شاعر بننے کا شوق چراتا ہے، وہ ہماری طرف رجوع کرتا ہے۔ ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ چشم ما روشن دل ما شاد! ہم اسے ایک فارم جس کی قیمت دس روپے ہے بذریعہ وی پی پی بھجوا دیتے ہیں۔ وہ اسے بھر کر ہمیں واپس کر دیتا ہے، ہم صرف اس کے اندراج کو غور سے پڑھتے ہیں جس میں اس کی مالی حالت کے متعلق دریافت کیا گیا ہے اور یہ جان کر کہ وہ مدرس یا کلرک ہونے کے علاوہ زمین یا جائیداد کا مالک بھی ہے، ہمیں بے حد مسرت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ وہ ہماری فرمائش پوری کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اب ہم اسے ایک کتابچہ بھجواتے ہیں، جس کی قیمت بیس روپے مقرر کی گئی ہے۔ جس میں اردو شاعری کی مشہور بحروں، اصناف، اصطلاحات کی تشریح کی گئی ہے اور یہ تمام معلومات ہم نے ایک مشہور شاعر (جو اب مرحوم اور مغفور ہو چکا ہے) کی تصنیف سے چرائی ہے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے ہمارے فرشتہ تک نہیں جانتے کہ ایک بحر اور دوسری بحر یا ایک رباعی اور ایک قطعہ میں کیا فرق ہوتا ہے۔ جب ہمارا کوئی نیا شاگرد یہ شکایت کرتا کہ کتابچہ پڑھنے کے باوجود بحر سے متعلق کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم اسے لکھ بھیجتے ہیں:

"کم و بیش تمام شعراء کا یہی حال ہے اور تو اور مولانا جلال الدین رومی کو یہ کہنا پڑا۔

شعر مے گویم بہ از اب حیات
من ندانم فاعلا تن فاعلات

اس لیے آپ کو گھبرانے یا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ دو ایک بحروں کے نام یاد رکھیے۔ محض دوسروں پر رعب ڈالنے کے لیے اور مشق سخن جاری رکھیے۔ اصلاح کے لیے اپنا کلام باقاعدگی سے بھجواتے رہیے۔ انشاء اللہ کچھ عرصہ کے بعد آپ کا شمار لائق قدر شعراء میں ہونے لگے گا"۔

شاگردوں کے کلام کی اصلاح کے لیے ہم نے دو تک بندوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ ان میں سے ایک دہلوی ہے اور دوسرا لکھنوی۔ شاعری کے متعلق تو وہ اتنا ہی جانتے ہیں جتنا ہم، لیکن پھر بھی ہم سے اچھے ہیں کیوں کہ تک سے تک ملا کر شعر مکمل کر دیتے ہیں۔ نیز انہیں گمنام شعرا کے سیکڑوں اشعار زبانی یاد ہیں جنہیں یہ ہمارے شاگردوں کی غزلوں میں شامل کر کے ان کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔

کلام کی اصلاح کے لیے ہم کوئی فیس وصول نہیں کرتے۔ مگر گاہے بہ گاہے ہر ایک شاگرد سے اس قسم کی فرمائش ضرور کیا کرتے ہیں

''ان دنوں کالی کھانسی میں مبتلا ہوں۔ یہی وجہ ہے آپ کی غزل کی نوک پلک سنوار نہیں سکا۔ ڈاکٹر نے خالص گھی استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے لیکن یہاں گھی نایاب ہے۔ سنا ہے آپ کے شہر میں ملتا ہے۔ اگر زحمت نہ ہو کسی آتے جاتے کے ہاتھ چار کلو خالص گھی بھجوا دیجئے''۔

''آپ کو یہ پڑھ کر خوشی ہوگی کہ عزیزہ نصرت کو خدا نے چاند سا بیٹا دیا ہے۔ اس مبارک موقع پر اسے کچھ دینا چاہتا ہوں لیکن بدقسمتی سے ہاتھ تنگ ہے کیا آپ کچھ دستگیری کریں گے؟۔

''عزیز یوسف کو میڈیکل کالج میں داخل کرانا ہے۔ داخلے کے لیے ایک ہزار روپے درکار ہیں، آپ تو جانتے ہیں، میرا بینک بیلنس صفر ہے۔ آپ جیسے احباب کی مدد سے ہی داخلہ ادا کیا جا سکے گا۔ کہئے اس معاملہ میں آپ میری کتنی مدد کر سکیں گے؟''

''ایک دفعہ آپ نے بلیچ آباد کے آموں کا ذکر کیا تھا۔ اور شاید وعدہ بھی کیا کہ اس سال آپ مجھے آم ضرور بھجوائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے مصروفیت کی وجہ سے آپ اپنا وعدہ ایفا نہیں کر سکے۔ کیا میں امید کروں کہ آپ اپنی اگلی غزل کے ساتھ آموں کا ٹوکرا بھی بھجوا رہے ہیں۔

''مفلسی میں آٹا گیلا میں تو بیمار تھا ہی اہلیہ محترمہ کی طبیعت بھی ناساز ہو گئی۔ حکیم صاحب نے قیمتی دوا کھانے اور روزانہ ڈیڑھ کلو دودھ پینے کے لیے کہا ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں مقاصد کے لیے روپے کی ضرورت پڑے گی۔ اگر مناسب سمجھیں تو کچھ بھجوا دیں۔ میں انتظار کروں گا''۔

خدا کا شکر ہے ہمارے سب شاگرد سعادت مند واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے انہیں جونہی

ہمارا خط ملتا ہے، وہ فوراً ہمیں معقول رقم یا مطلوبہ چیز بھجوا دیتے ہیں۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ہمارے گھر میں کوئی ایسی چیز نہیں جسے ہم نے اپنے پیسوں سے خریدا ہو۔ اگر غالیچہ غلیظ فضولی نے بھجوایا تھا تو کرسیاں کرتار فضولی نے کرتار پور سے لا دی تھیں۔ ٹی سیٹ منحوس فضولی کی دین ہے اور ٹیبل لیمپ جناب فانوس فضولی نے پیش کیا تھا۔

کچھ حاسد اور تنگ نظر قسم کے لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم خوامخواہ لوگوں کو بہکا رہے ہیں یا الو بنا رہے ہیں۔ ہم ہمیشہ ان کی خدمت میں یہ عرض کیا کرتے ہیں۔ ''جس طرح تک بند سے شاعر ہونا اچھا ہے۔ اسی طرح کچھ نہ ہونے سے تک بند ہونا اچھا ہے''۔

''پھر جب ہمیں اور ہمارے شاگردوں کو کوئی اعتراض نہیں تو آپ کو کیوں یہ فکر دن رات کھائے جا رہا ہے کہ شاعروں کی بجائے ہم تک بندوں کی فوج تیار کر رہے ہیں''۔

لیکن سب لوگ معترض نہیں ہوتے، کچھ ہمدرد بھی ہوتے ہیں۔ اسی قسم کے ایک مہربان نے ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا اور سچ تو یہ ہے۔ بجا کہا تھا۔ ''فضول صاحب! آپ پرواز کیجئے۔ کوئی جلتا ہے تو جلنے دیجئے۔ آپ شاعری اور تک بندی کی بحث میں نہ پڑیئے۔ بس اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھئے۔ باقی رہے معترضین تو ان کا منہ بند کرنے کے لیے عرفی کے اس مصرع کا استعمال کیا کیجئے

آواز سگاں کم نہ کند رزق گداں را

☆☆☆

مشورہ ہمسائے کو!

حضور! یہ ٹھیک ہے آپ کے اور ہمارے گھر کے درمیان صرف ایک دیوار ہے لیکن یہ ٹھیک نہیں کہ آپ ہمیشہ دیوار کے ساتھ کان لگا کر وہ گفتگو سننے کی کوشش کریں جو میں اپنی بیوی سے کر رہا ہوں اور جب آپ کو گفتگو سننے کی کوشش کریں جو میں اپنی بیوی سے کر رہا ہوں اور جب آپ کو گفتگو کا کوئی حصہ صاف سنائی نہ دے۔ اپنی بیوی سے کہیں وہ کچھ کہہ تو رہا ہے۔ لیکن پتا نہیں چلتا کیا کہہ رہا اور آپ کی یہ بات سن کر مجھے اس دیہاتی کا واقعہ یاد آ جاتا ہے جو اپنی

بیوی کو فلم دکھانے کے لیے لے گیا۔ جب فلم شروع ہوئی وہ اپنی بیوی سے بلند آواز میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک شہری نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ مسٹر آپ دونوں باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ دیہاتی نے اسے جھڑکتے ہوئے جواب دیا۔ معاف کیجئے! آپ کو وہ باتیں سننے کا کوئی حق نہیں جو میں اپنی بیوی سے کر رہا ہوں۔ یہ ہماری نجی باتیں ہیں۔ اگر آپ کو سنائی نہیں دیتیں تو شکایت کرنے کی بجائے آپ کو چپ رہنا چاہیے۔

جو مشورہ اس دیہاتی نے شہری کو دیا تھا، وہی میں آپ کو دینا چاہتا ہوں۔ یہ تو صحیح ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ لیکن اگر دیواریں بہری ہوں تو انہیں زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

ایک حد سے موٹی فلم ایکٹرس کو

محترمہ! جب آپ کو پہلے پہل فلموں میں کام کرتے دیکھا تو آپ کا بوٹا سا قد، چھریرا بدن اور بھولی سی صورت دیکھ کر بے اختیار مجروح کا یہ شعر یاد آ گیا تھا۔

دل کو کوئی بچا سکے کیونکر
اس کے انداز ہیں قیامت کے

مگر خدا جانے یہ بمبئی کی آب و ہوا کا اثر ہے یا اس چربی والی خوراک کا جسے آپ بڑی رغبت سے کھاتی ہیں کہ اب آپ ایک نازک اندام حسینہ کی بجائے ہتھنی نظر آنے لگی ہیں۔ پہلے جب آپ ہنستی تھیں معلوم ہوتا دور کہیں سونے کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ اب ہنستی ہیں تو لگتا ہے نزدیک کہیں ڈھول بج رہا ہے۔ اب جب کبھی مسکراتی ہیں پہلے کی نسبت زیادہ بدصورت نظر آتی ہیں۔ اس حالت میں ہیرو آپ سے خاک محبت کر سکے گا۔ اتنا تو آپ بھی جانتی ہوں گی کہ عشق چاہے وہ فلمی عشق ہی کیوں نہ ہو، محبوبہ سے کیا جاتا ہے، اماں سے نہیں۔ کیا ہی اچھا ہو، اگر آپ فلم انڈسٹری سے ریٹائر ہو کر بتولن بن جائیں اور اگر آپ کو یہ مشورہ پسند نہیں تو کسی سرکس میں نوکری کر لیں جہاں دیگر عجیب و غریب جانوروں کے ساتھ آپ کی بھی نمائش کی جا سکے۔

☆☆☆

ایک ظالم ساس کو

آپ اکثر کہا کرتی ہیں کہ جب میں بہو تھی، مجھے کام کی ساس نہ ملی اور جب میں ساس بنی مجھے کام کی بہو نہ ملی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ میں آورش بہو یا آورش ساس بننے کی اہلیت ہی نہیں۔ آپ ہر روز مندر میں ست نارائن کی کتھا سننے جاتی ہیں۔ لیکن مندر سے واپس آ کر اپنی بہو کی ایسی خبر لیتی ہیں کہ بیچاری کو خدا یاد آ جاتا ہے۔ پہلے اسے اس قسم کے طعنہ دیتی ہیں جنہیں سن کر اس کا کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ ''تمہاری ماں نے تمہیں بہت کچھ سکھایا۔ مگر کرنا کھایا دھوکا دینا سکھایا۔ جھوٹ بولنا سکھایا۔ لیکن اگر ایک چیز نہیں سکھائی تو وہ ہے بڑوں کی عزت کرنا۔ اونچے خاندان کی لڑکیاں چاہے کتنی ہی تعلیم یافتہ ہوں اونچی ہی ہوتی ہیں''۔ اگر وہ پروٹسٹ کرتی ہے تو آپ اسے بے دردی سے پیٹتی ہیں اور جب اس کا خاوند دفتر سے گھر آتا ہے اسے پٹی پڑھاتی ہیں کہ ایسی بے شعور بیوی کو طلاق دینے میں ہی بھلائی ہے۔ ہمارا آپ کو مشورہ ہے۔ یا تو ست نارائن کی کتھا سننا بند کر دیں ورنہ لوگ کہیں گے آپ وہ چکنا گھڑا ہیں جس پر ست نارائن کتھا کی بوندیں پڑتے ہی پھسل جاتی ہیں۔

☆☆☆

ہلڑ مچانے والے شرابیوں کو

آپ ہر رات شراب پینے کے بعد محلہ میں ہنگامہ برپا کرتے ہیں، زور زور سے چیختے ہیں، جانوروں کی بولیاں بولتے ہیں، خاص کر بکرے کی آواز کی نقل کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ گیا گزرا بکرا بھی اتنا خوددار ہوتا ہے کہ وہ صرف ''پ'' بولتا ہے انسان کی بولی نہیں بولتا۔ کیا آپ بکرے سے گئے گزرے ہیں؟

اکثر آپ موج میں آ کر میر کا یہ مصرع تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ گنگنایا کرتے ہیں۔

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں

آپ ہی کہئے آپ کی نازیبا حرکتیں دیکھ کر آپ کو کون معاف کر سکتا ہے۔ آپ کی اس دلیل میں کوئی وزن نہیں کہ اگر آپ شراب پینے کے بعد بے ہودہ حرکتیں نہ کریں تو شراب کی

بجائے پانی ہی نہ پی لیا کریں۔ آپ کو شاید علم ہوگا آج کل شراب پانی سے بھی زیادہ پی جارہی ہے۔ اس لیے اگر آپ شراب پیتے ہیں کوئی بڑا تیر نہیں مارتے، ہزاروں لوگ ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں شراب پیتے ہیں۔ اگر وہ سب آپ کی طرح ہلڑ مچائیں تو ہر محلہ پاگل خانے کا منظر پیش کیا کرے۔ آپ کو ہمارا مشورہ ہے اگر آپ شراب پینے سے رہ نہیں سکتے تو کم از کم شراب پینے کے بعد غیر مہذب حرکتیں کرنے سے توبہ کرلیں۔

☆☆☆

ملاوٹ کرنے والے کو!

سنا ہے آپ کھانے پینے کی چیزوں اور ادویہ میں ملاوٹ کرنے کے فن میں ماہر ہیں۔ ہلدی میں مکی کا آٹا اور بنفشے میں سوکھی گھاس اس ہوشیاری سے ملاتے ہیں کہ کسی کو پتا نہیں چلتا۔ اکثر کیپسول میں دوا کی بجائے میدہ یا میٹھا سوڈا بھر کر ان پر قیمتی اور مشہور دواؤں کے نام لکھ دیتے ہیں۔ ملاوٹ کرنے کے حق میں آپ یہ دلائل دیتے ہیں۔

(1) انگریزی دوائیں حد سے زیادہ گرم اور خشک ہوتی ہیں۔ اگر ان میں ملاوٹ کی جائے تو وہ معتدل ہو جاتی ہیں۔

(2) سنکھیا میں ہم اس لیے ملاوٹ کرتے ہیں تاکہ اسے کھا کر کوئی شخص خودکشی نہ کر سکے۔

(3) کھانڈ میں آٹا اس لیے ملاتے ہیں تاکہ ان لوگوں کو فائدہ پہنچے جو ذیابیطس کے مرض میں مبتلا ہیں۔ آپ کی یہ ساری دلیلیں فضول اور بے معنی ہیں۔ دراصل آپ زیادہ سے زیادہ کمانے کی لیے چیزوں میں ملاوٹ کرتے ہیں۔

آپ اس ڈاکو سے بدتر ہیں جو پستول دکھا کر روپیہ اور زندگی میں سے ایک چیز کا مطالبہ کرتا ہے..... کیونکہ آپ دونوں چیزیں چاہتے ہیں۔

آپ کو ہمارا مشورہ ہے کہ اگر آپ قانون سے نہیں ڈرتے تو یمراج سے ڈریں وہ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا کیونکہ آپ میں اور قاتل میں زیادہ فرق نہیں۔

☆☆☆

جب انہوں نے کالج کھولا

وہ تعداد میں نو تھے۔ اکبر کے نورتنوں کی طرح! بے تکلف دوستوں کی محفل میں ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا جاتا ہے۔ آپ سے ملئے۔ آپ لالہ جھاڑو مل ہیں اور بھینسوں کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ پچھلے بیس سال سے دودھ میں پانی ملا کر بیچ رہے ہیں۔ اس منافع بخش بیوپار سے انہوں نے لاکھوں روپے کمائے ہیں۔ اور انہیں کائر چند کہتے ہیں ان کی سٹیشنری کی دکان ہے۔ یہ مشہور معروف ''طوطا مینا'' کا پیاں جن کے ٹائیٹل پر طوطا مینا کی تصاویر ہوتی ہیں، فروخت کرتے ہیں۔ اور ان کا نام امرناتھ ہے۔ آپ مونگ پھلی کے بیوپاری ہیں۔ انہیں شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ کیونکہ کس بچے کو مونگ پھلی کھانے کا شوق نہیں ہوتا؟ اور یہ ہیں چودھری فتح چند، آپ بالکل ان پڑھ ہیں اور ہنولوں کا بیوپار کرتے ہیں۔ اور آپ بنارسی داس کہلاتے ہیں اور ان کی شکل وصورت بنارسی ٹھگوں سے ملتی جلتی ہے۔ آپ افیم و چرس کی سمگلنگ کرتے ہیں۔ بخشی جے دیو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ شراب کے سب سے بڑے ٹھیکے کے مالک ہیں اور ہر وقت نشے میں دھت رہتے ہیں۔ پنڈت دھیان چند ایک بے کار نوجوان ہیں جن کے والد بھی عمر بھر بیکار رہے۔ منشی دینا ناتھ جی ہیں جو ایک گم نام وکیل کے منشی رہے ہیں اور پھر سردار پستہ سنگھ پستہ ہیں جن کا قد ایک میٹر ہے اور جو کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کرنے کے فن میں ماہر ہیں۔ بنفشہ میں سوکھی گھاس اور پسے ہوئے نمک میں آٹا اس صفائی کے ساتھ ملاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ایک رات کو جب لالہ جھاڑو مل کو نیند نہیں آ رہی تھی اور وہ بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ انہیں یک لخت الہام ہوا کہ قصبہ میں کالج کھولنا چاہیے۔ آدھی رات کے بعد انہیں نیند آ گئی اور انہوں نے خواب میں دیکھا۔ ان کے قصبہ میں کالج کھل گیا ہے جس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ، فرانس اور امریکہ کے طلبہ بے قرار ہیں۔ جب صبح ہوئی انہوں نے کائر چند، امرناتھ اور فتح چند کو اپنے گھر بلوا بھیجا اور انہیں دودھ کہ جس میں پچھتر فی صد پانی تھا، پیش کرنے کے بعد کہا۔ ''کتنی عجیب بات ہے ہمارے قصبہ میں کوئی کالج نہیں''۔ لالہ کائر چند نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے جواب دیا ''اگر کالج ہوتا، ہماری طوطا مینا کی کاپیاں ہزاروں کی تعداد میں بکا

کرتیں''۔ چودھری فتح چند بولے۔ ''اگر کالج نہیں تو کیا ہوا، بنولے نکالنے کی مشین تو ہے''۔ لالہ امرناتھ نے بحث میں حصہ لیتے ہوئی فرمایا۔ ''قوم کو بنولوں کی نہیں مونگ پھلی کی ضرورت ہے''۔ چنانچہ کوئی فیصلہ کیے بغیر اجلاس ملتوی ہوگیا۔

دوسرے اجلاس میں باقی نورتنوں کو بھی شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ خوب گرما گرم بحث ہوئی۔ بخشی جے دیو کالج کھولنے کے حق میں تھے بشرطیکہ ان کے لڑکے کو جو مڈل فیل تھا، کالج میں ہیڈ کلرک لگا دیا جائے۔ نیز کالج کے پروفیسروں کو ان کے ٹھیکے سے شراب خریدنے پر مجبور کیا جائے۔ شری بنارسی داس کا خیال تھا کالج کھولنے کی بجائے نوجوان کو افیم اور چرس کی سمگلنگ کرنے کی تربیت دینی چاہیے۔ کائر چند چاہتے تھے کالج کے طلبہ کے لیے یہ لازمی قرار دیا جائے کہ وہ صرف طوطا مینا کا پیاں ہی خریدیں گے۔ پستہ سنگھ کا مطالبہ تھا کہ سب پروفیسر کھانے پینے کی چیزیں ان کی دکان سے ہی خریدیں۔

تیسرے اجلاس میں کالج کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لالہ بنارسی داس نے کالج کو زمین دینے کا اس شرط پر اعلان کیا کہ عمر بھر وہ مینجنگ کمیٹی کے پردھان رہیں گے اور ان کی وفات کے بعد ان کا لڑکا پردھان بنے گا۔ لالہ جھاڑومل کالج کے لیے ہال بنوانے پر رضامند ہوگئے بشرطیکہ اس کا نام ان کے پتا کے نام پر ''کوڑامل ہال'' رکھا جائے۔ امرناتھ اور فتح چند نے کالج کے کمرے بنوانے کا وعدہ کیا بشرطیکہ کالج میں چپڑاسی ان کی مرضی سے لگائے جائیں۔ باقی نورتنوں نے دو ایک شرطیں منوانے کے بعد کالج کی مدد کرنے کی حامی بھری۔ کالج کا نام ''گنڈامل جھنڈامل'' کالج رکھا گیا۔ گنڈامل اور جھنڈامل قصبہ کے دو غنڈے تھے جن سے شریف آدمی پناہ مانگتے تھے۔

شری گنگا دھریا ٹھگ کو پرنسپل مقرر کیا گیا۔ انہوں نے ایم اے ہندی کا امتحان تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ حد سے زیادہ بدصورت تھے۔ لالہ جھاڑومل کا خیال تھا پرنسپل اس شخص کو لگانا چاہیے جسے اندھیرے میں ہی نہیں اجالے میں بھی دیکھ کر آدمی بے ہوش ہو جائے۔ کائر چند نے انہیں اس لیے پسند کیا تھا کیونکہ انہوں نے طوطا مینا کاپیوں کی سرپرستی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ امرناتھ نے انہیں اپنا ووٹ اس لیے دیا تھا کیونکہ وہ مونگ پھلی کو بادام سے بہتر خشک میوہ سمجھتے تھے۔

پروفیسر کا انتخاب کرتے وقت اس بات کو پیش نظر رکھا گیا کہ ہر ممبر کے کسی نزدیک یا دور

کے رشتہ دار کو موقع دیا جائے۔ لالہ جھاڑومل کے بہنوئی چندر بھوشن کو انگریزی کا پروفیسر لگایا گیا۔ حالانکہ اس بیچارے کو انگریزی تو کہاں ہندی تک نہیں آتی تھی۔ بخشی جے دیو کے داماد کو وائس پرنسپل مقرر کیا گیا، حالانکہ وہ پروفیسر لگائے جانے کا بھی مستحق نہ تھا۔ شری بنارسی داس کے سالے کو حساب پڑھانے کی ذمہ داری سونپی گئی، اگرچہ وہ اس کام کے لیے ناموزوں ترین شخص تھا۔ جن اشخاص کو لیاقت کی بنا پر پروفیسر مقرر کیا گیا، انہیں اڑھائی سو روپے تنخواہ دینے مگر ان سے سات سو روپے کی رسید لینے کا فیصلہ کیا گیا۔..... پہلے سال داخلہ کافی حوصلہ افزا ہوا۔ یعنی ڈیڑھ سو طلبہ اور پچاس طالبات۔ پرنسپل گنگا دھر نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''آپ نہایت خوش قسمت ہیں کہ آپ نے اس کالج میں داخلہ لے لیا جس کا نام گنڈا مل جھنڈا مل کالج ہے اور جس کا میں پرنسپل ہوں۔ اگر ان دو باتوں کے باوجود آپ پاس نہ ہو سکیں تو سمجھ لیں آپ پاس ہونے کے قابل ہی نہیں۔ اس صورت میں آپ وہی بڑوں یا چاٹ کی دکان کھول لیں۔''

کالج کھلنے کے تین ماہ بعد آدھے پروفیسروں کو کسی نہ کسی قصور کی بنا پر برخاست کر دیا گیا۔ ایک پروفیسر کو اس لیے کیونکہ اس نے لالہ بنارسی داس کے لڑکے کو جوڑ کیوں کو چھیڑا کرتا تھا، جرمانہ کر دیا تھا۔

مینجنگ کمیٹی نے اپنے ریزولیوشن میں لکھا۔ ''ہم اسے اس لیے برخاست کر رہے ہیں تاکہ باقی پروفیسر اس سے عبرت پکڑیں، ایک اور کو اس لیے جواب دیا گیا کیونکہ وہ لالہ بنارسی داس کی خاطر ایک بیگ میں ناجائز افیم چھپا کر بمبئی جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مینجنگ کمیٹی نے اسے برخاست کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا۔ ''ایسا بزدل شخص پروفیسر بننے کے قابل نہیں''۔

کالج کے وہ پروفیسر جو کنبہ پروری کی وجہ سے لگائے گئے تھے، پڑھانے کے معاملے میں بالکل کورے تھے اور وہ جو پڑھانا جانتے تھے اس لیے نہیں پڑھاتے تھے کیونکہ ان کو تنخواہ کم دی جا رہی تھی، لیکن رسید پوری تنخواہ کی دی جا رہی تھی۔

پہلے سال جب یونیورسٹی کا نتیجہ نکلا، کالج کے صرف پانچ فی صد طلبا کامیاب ہوئے۔ قصبہ کے لوگ اور خاص طور پر گنڈا مل اور جھنڈا مل غصے سے لال بھبوکا ہو گئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا، مینجنگ کمیٹی، پرنسپل اور پروفیسروں کی وہ مرمت کی جائے کہ ساری عمر یاد رکھیں۔ ادھر جب یہ خبر

ان لوگوں تک پہنچی جن کی مرمت ہونے والی تھی، وہ راتوں رات روپوش ہو گئے اور آج تک روپوش ہیں۔ اگر آپ کو پتا چلے وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں تو قصبہ سنگر پور کے سرپنچ کو اطلاع دیں۔ شکریہ کے علاوہ آپ کی خدمت میں سو روپے نقد پیش کیے جائیں گے۔

☆☆☆

بالغوں کے لیے پہلی کتاب

پہلا سبق (ماں، بچہ اور باپ)

آیا بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ ماں پیانو بجا رہی ہے۔ باپ کو کا کولا پی رہا ہے۔ کبھی کبھی اپنی بیوی کی آنکھ کو بچا کر آیا کی طرف دیکھ لیتا ہے۔ ظاہر ہے وہ بیوی سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ماں پیانو بجاتے بجاتے تھک جاتی ہے تو ریکارڈ پلیئر پر کوئی نیا ریکارڈ سننے کے لیے رکھ دیتی ہے..... آہا ہا! یہ تو کوکی ناچ کی دلہن ہے۔ وہ دیکھو۔ ماں ناچ رہی ہے۔ باپ سوچ رہا ہے۔ کاش میں آیا کے ساتھ ناچ سکتا۔ ناچ ختم ہوتا ہے۔ باپ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ خوب!! بچہ یہ الفاظ سن کر مسکراتا ہے۔ وہ جانتا ہے باپ جھوٹ بول رہا ہے۔ ماں بچے کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہتی ہے۔ میرے لال! وہ دن کب آئے گا۔ جب تو بڑا ہو گا اور میں تیری آیا کو برخاست کر سکوں گی۔ یہ کم بخت آیا نہیں آئی میری شامت آئی ہے۔ ہر وقت تمہارا باپ للچائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ خدا جانے اس کا کیا ارادہ ہے۔ ویسے تو مرد کی فطرت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے۔ مگر جب آدمی کی عمر پینتالیس برس ہو جائے اسے کچھ شرم تو آنی چاہیے۔

دوسرا سبق (کسان ٹریکٹر چلا رہا ہے)

بڑی محنت کرتا ہے۔ دن چڑھتے ہی ٹریکٹر چلانے لگتا ہے۔ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں فارغ ہو جائے گا۔ پھر گپیں ہانکے گا۔ دوسرے کسانوں کے ساتھ لڑے گا۔ شراب پیے گا۔ وہ دن گئے جب سارا دن ہل چلاتا تھا۔ کیوں میاں! وہ تمہارا ہل کہاں گیا؟ وہ میں نے لکڑیاں بیچنے والے

ایک دوکان دار کے پاس فروخت کر دیا۔ اور بیلوں کی جوڑی؟ وہ ایک کوہلو کا مالک خرید کر لے گیا۔ ہاں ٹھیک ہے جب ٹریکٹر ہو تو پھر بیلوں کی کیا ضرورت ہے۔ پھر بھی کبھی کبھی بیلوں کی یاد آتی تو ہوگی۔ جی ہاں ضرور آتی ہے۔ خاص کر جب چابک مارنے یا گالیاں دینے کو جی چاہتا ہے۔ میاں دھیان سے ٹریکٹر چلایا کرو، کہیں کوئی حادثہ نہ ہو جائے، مشین کا کیا اعتبار ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کبھی آدمی مشین پر اور کبھی مشین آدمی پر سوار ہو جاتی ہے۔ اچھا بھائی۔ خوش رہو خوب ٹریکٹر چلاؤ، پیداوار بڑھاؤ، خود بھی کھاؤ اور دوسروں کو بھی کھلاؤ۔

تیسرا سبق (پروفیسر طلبہ کو پڑھا رہا ہے)

رات ایک بجے تک شطرنج کھیلتے رہے۔ سبق تیار نہ کر سکے، آپ ادھر ادھر کی باتوں سے طلباء کا دل بہلا رہے ہیں۔ ایلو! انہوں نے اپنے انگلینڈ جانے کا قصہ چھیڑ دیا۔ یہ قصہ وہ پہلے بھی کئی بار سنا چکے ہیں۔ طلبا ان کی باتیں سن کر ہنس رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں خوش ہو رہے ہیں۔ یہ قصہ ختم ہوا۔ اب وہ اپنے ایک معاشقے کی داستان سنا رہے ہیں۔ آؤ ذرا ہم بھی سنیں۔

''اس وقت میری عمر اٹھارہ برس تھی۔ میں بی اے میں پڑھتا تھا، ایک امیر زادی دل و جان سے مجھ پر فریفتہ ہوگئی۔ چونکہ میں کسی اور لڑکی سے محبت کرتا تھا اس لیے میں نے اسے منہ نہ لگایا'' منہ نہ لگانے کے محاورہ پر طلبہ قہقہہ لگا کر داد دے رہے ہیں۔ کچھ کہہ رہے ہیں نہایت دلچسپ قصہ ہے۔ بڑے کام کی چیز ہے۔ پروفیسر وہی اچھا ہے جو دلچسپ قصے سنائے۔ جو نصاب یونیورسٹی نے مقرر کر رکھا ہے اس کے متعلق کچھ نہ بتائے۔ طلبہ کو نہ خانے کے بعد سمجھ لیا کرے اس نے پڑھانے کا حق ادا کر دیا ہے۔

چوتھا سبق (کالج کا طالب علم)

بڑا بانکا جوان ہے۔ سر کے بال ضرورت سے زیادہ بڑھا رکھے ہیں۔ کیوں صاحبزادے! کیا تمہارے شہر میں نائی نہیں ہوتے؟ جی یہ بات نہیں۔ لمبے بال رکھنا تو فیشن میں داخل ہے۔ میاں! کیا کبھی کلاس روم میں بھی جاتے یا کالج کے آنگن میں گھوم پھر کر گھر چلے آئے ہو؟ جی کبھی کبھی غلطی سے کلاس روم میں بھی چلا جاتا ہوں۔ لیکن فوراً باہر آ جاتا ہوں۔ لیکچر اتنا خشک ہوتا

ہے کہ سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ پھر وقت کس طرح کاٹتے ہو۔ نک شاپ میں بیٹھا رہتا ہوں۔ چائے پیتا ہوں۔ چائے پی پی کر جب تنگ آ جاتا ہوں۔ خوب صورت تیتریوں کا تعاقب کرتا ہوں۔ تعجب! پھر آخر پاس کس طرح ہو جاتے ہو؟ امتحان پاس کرنے کے لیے اس فارمولے کا استعمال کرتا ہوں جسے ''یا نقل تیرا آسرا'' کہا جاتا ہے۔ لیکن تھوڑا بہت پڑھ بھی لیا کرو۔ علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ لیکن پڑھنے کے بغیر ڈگری مل جائے پھر پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھا برخوردار جو جی میں آئے کرو۔ بزرگوں کا نام روشن کرو۔ اجی بزرگوں نے ہمارے لیے کیا کیا ہے جو ہم ان کا نام روشن کرتے پھریں۔ یہی کیا کم ہے۔ ہم نے ان کے سارے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔

پانچواں سبق (کالج کی طالبہ)

لڑکی بالکل نہیں لگتی مگر لڑکی ہی ہے۔ پھر اس نے لڑکے کی طرح کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟ یہ تو آج کل فیشن ہے۔ لڑکے لڑکیاں بن رہے ہیں۔ لڑکیاں لڑکے، کوئی اپنی سیکس سے خوش نہیں۔ اس نے دوپٹا گلے میں کیوں لٹکا رکھا ہے؟ سر پر کیوں نہیں لیتی؟ سر پر دوپٹا لینا جہالت کی نشانی ہے۔ کیوں بیٹا! تم نے اپنی سر پر گھونسلا سا بنا رکھا ہے؟ کیا تمہاری لیڈی پروفیسر بالوں کے اس فیشن پر اعتراض نہیں کرتی۔ جی انہی سے تو بالوں کا یہ فیشن سیکھا ہے۔ کچھ پڑھتی لکھتی ہو یا سارا وقت فلمیں اور ٹیلی ویژن دیکھنے میں گزارتی ہو؟ بہت کچھ پڑھتی ہوں۔ ہر قسم کے فلمی رسالے، جاسوسی ناول اور اردو کی عشقیہ غزلیں۔ کچھ گھر کا کام بھی کرتی ہو؟ بالکل نہیں۔ گھر کا کام تو وہ لڑکی کرتی ہے جو کالج کی طالبہ نہیں ہوتی۔ اگر وہ کالج کی طالبہ ہونے کے باوجود گھر کا کام کرتی ہے تو وہ یقیناً عقل مند نہیں ہوتی۔ واہ! کیا نقطہ پیدا کیا ہے۔ طبیعت خوش ہو گئی بے اختیار زبان پر یہ مصرع آ گیا۔ ع

جو بات کی خدا کی قسم لا جواب کی

اچھا جیتی رہو! ابھی بچپنا ہے کھیلنے اور کھانے کے دن ہیں۔ تم سے ذہانت کی امید کرنا بیکار ہے۔

چھٹا سبق (نقلی ڈاکٹر)

بڑا ہوشیار ہے۔ ہر مرض کا علاج کر سکتا ہے۔ تشخیص کرنے کا بڑا اچھا طریقہ نکالا ہے۔ مریض سے پوچھ لیتا ہے۔ تمہارے خیال میں تمہیں کیا شکایت ہے۔ اس طرح خود تشخیص کرنے کی زحمت سے بچ جاتا ہے۔ مرض سمجھ میں آئے یا نہ آئے دوا ضرور دیتا ہے۔ اگر مریض کہے اسے کچھ فائدہ نہیں ہوا تو بڑے پیار سے سمجھاتا ہے۔ میرا کام دوا دینا ہے۔ شفا تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کئی بار دوا کی بجائے پانی کا ٹیکہ بھی لگا دیتا ہے۔ کیوں میاں۔ ایسا کیوں کرتے ہو؟ اجی پیسے تو ٹیکے کے ہی وصول کرتا ہوں۔ تپ دق کے مریض کا زکام کی اور دل کے مریض کو بدہضمی کی دوا دیتا ہے۔ کہتا ہے زکام جب بگڑ جائے پرانا بخار بن جاتا ہے۔ بدہضمی حد سے بڑھ جائے دل کمزور ہو جاتا ہے۔ جن مریضوں کا علاج کرتا ہے، وہ اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ ایک طرح سے دیکھا جائے، یہ اچھا ہی ہوتا ہے، مریضوں کو دائمی سکون مل جاتا ہے۔ بیٹے وقت سے پہلے باپ کی جائیداد کے مالک بن جاتے ہیں، شوہروں کو پھوہڑ بیویوں سے نجات مل جاتی ہے، آبادی کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب! اگر ہر ڈاکٹر آپ کے نقش قدم پر چلے تو دباؤ کیا آبادی ہی نہ رہے۔ حضرات! یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔ ہمیں تو اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے۔ آبادی کی اتنی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ کبھی صفر نہیں ہوگی۔ کیونکہ کچھ مریض ایسے بھی ہوتے ہیں، جو ہم سے علاج کرانے کے باوجود بچ جاتے ہیں۔

ساتواں سبق (نقلی سادھو)

بالکل اصلی سادھو کی طرح لگتا ہے۔ لمبی لمبی جٹائیں، بھگوے کپڑے، ماتھے پر تلک، ہاتھ میں کمنڈل، گلے میں مالا۔ لگے زجن کا نعرہ اتنے زور سے لگاتا ہے کہ چھوٹے بچے ڈر کے مارے سہم جاتے ہیں، ہر بھگت سے اپنے لیے ایک جوتا خریدنے کے لیے دان مانگتا ہے۔ جتنا دان لے چکا ہے، اس سے جوتوں کی ایک اچھی خاصی دکان کھول سکتا ہے۔ پڑھا لکھا واجبی سا ہے، کام کرنے سے خدا واسطے کا بیر ہے۔

"سادھو جی مہاراج! آپ کام کیوں نہیں کرتے۔ دیکھنے میں ہٹے کٹے نظر آتے ہیں۔ اجی

اگر کام ہی کرنا ہوتا پھر سادھو بننے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے دنیا چھوڑ دی تا کہ کام کرنے سے بچ جائیں۔ کام کرنے کو ہمارے بھگت جو ہیں''۔ لیکن آپ محنت سے کیوں جی چراتے ہیں؟ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا، ہم محنت سے جی چراتے ہیں۔ ان کے مستقبل کے متعلق پیش گوئیاں کرنا پڑتی ہیں۔ تعجب ہے بیسویں صدی میں ایسے لوگ ہیں جو آپ کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ جی ہاں! پرماتما کا شکر ہے۔ ابھی کچھ بھگت جہان میں باقی ہیں، ورنہ آپ کا بس چلے تو آپ پر ہر شخص کو یہ دعا دیا کریں۔

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے
خصوصاً آج کل کے اولیاء سے

آٹھواں سبق (نقلی جوتشی)

جوتش کے علاوہ ہر علم جانتا ہے پھر بھی پیش گوئیاں کرنے سے باز نہیں آتا۔ ایسے عجیب وغریب قیافے لگاتا ہے کہ لوگ دنگ رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس سال گرمی کے موسم میں گرمی پڑے گی اور سردی کے موسم میں سردی پڑے گی اور سردی کے..... برسات کے موسم میں البتہ بارش ہوگی۔ خزاں کے موسم میں درختوں کے پتے جھڑیں گی۔ بہار کے موسم میں پھول کھلیں گے۔ کسی بڑے ملک میں قحط پڑے گا۔ جب بھی کسی بڑے آدمی کی وفات ہوتی ہے بڑے فخر کے ساتھ اعلان کرتا ہے۔ ہم پچھلے بیس سال سے کہتے آ رہے ہیں کہ اس سال اس کی موت ضرور ہوگی۔ جنم پتری بنانے میں ماہر ہے۔ ہر بچے کے بارے میں کہتا ہے، اس پر سنیچر کا سایہ ہے۔ جس کا اپائے نہ کیا گیا تو یہ فلاں بیماری میں مبتلا ہو جائے گا۔

کیوں جوتشی جی! آپ نے جوتش کا علم کہاں سے سیکھا تھا؟ کہیں سے بھی نہیں۔ اگر یہ علم سیکھنے سے آ جاتا تو ہر شخص جوتشی نہ بن جاتا۔ یہ علم تو ہمیں ورثہ میں ملا ہے۔ ہمارا باپ جوتشی تھا، ہمارا دادا جوتشی تھا اور ہمارے دادا کا دادا بھی جوتشی تھا۔ کیا آپ کو آپ کا ضمیر لعنت ملامت نہیں کرتا کہ آپ لوگوں کو ٹھگ رہے ہیں؟ اجی صاحب ضمیر کی بھی ایک کہی۔ اسے سمجھا بجھا کر چپ کرایا جا سکتا ہے باقی رہی ٹھگنے کی بات، تو صاحب! ہر شخص باقی اشخاص کو ٹھگ رہا ہے اور اگر کوئی ٹھگ نہیں رہا تو وہ نرا کاٹھ کا الو ہے یا اس کا بس نہیں چلتا۔

نواں سبق (نقلی پروفیسر)

بی اے فیل ہے، ایم اے کے طلبہ کو پڑھاتا ہے۔ کسی جعلی یونیورسٹی سے ایم اے اور پی۔ ایچ ڈی کی ڈگریاں خرید لی تھیں۔ ان کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اپنا کالج کھول رکھا ہے۔ پرنسپل کہلاتا ہے۔ کالج کا نام بھی کافی دلکش ہے۔ یعنی انٹرنیشنل کالج۔ اکثر شیخی بگھارتے ہوئے کہتا ہے۔ ''ایک زمانہ تھا، جب ہمارے کالج میں چین، جاپان، روس اور امریکہ سے طلبہ پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے''۔ ہر اخبار میں اشتہار دیتا ہے۔ فلاں سال ہمارا فلاں طالب علم یونیورسٹی میں اول رہا۔ فلاں سال ہمارے سات طلبہ، آئی اے۔ ایس کے امتحان میں کامیاب ہوئے لیکن یہ کبھی نہیں بتایا کہ ان کے نام کیا تھے۔ حالانکہ غلط انگریزی بولتا ہے، دعویٰ یہ کرتا ہے، آکسفورڈ اور کیمرج کے پروفیسر بھی ایسی صحیح انگریزی نہیں بول سکتے۔ اس کی لیاقت کے کئی قصے مشہور ہیں۔ جب نوبل انعام یافتہ بورس پستر ناک کا شہرہ آفاق ''ڈاکٹر زواگو'' چھپا تو اس سے کسی نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر زواگو کے متعلق کیا خیال ہے''۔ بڑے وثوق کے ساتھ بولا۔ ''بڑا مشہور ڈاکٹر ہے۔ پیٹ کی بیماریوں کا علاج کرنے میں ماہر ہے''۔ کسی نے اور سوال کیا۔ ''مایا کووسکی، کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟'' فرمایا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ ایک قسم کی وسکی ہے''۔ ہمیشہ خوش رہتا ہے۔ اگر کوئی اس کی لاعلمی کی طرف اشارہ کرے۔ تو مسکرا کر کہتا ہے ''ہمیں تو یہ لاعلمی بڑی راس آئی ہے۔ اس کی بدولت ہمارے پاس کوئی نہیں ہے، کار ہے۔ بینک بیلنس ہے۔ یعنی آپ جیسے علماء سے بہتر ہیں جنہیں اپنی تمام علمیت کے باوجود دو وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا''۔

☆☆☆

بالغوں کے لیے دوسرے کتاب

جانوروں کا بیان..... (بلی)

بلی چوہے سے بڑی اور کتے سے چھوٹی ہوتی ہے۔ لیکن ہر چیز جو چوہے سے بڑی اور کتے سے چھوٹی ہو۔ ا۔ بلی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر خرگوش کو کسی حالت میں بلی نہیں کہا جا سکتا۔ بلی تو نو

سوچو ہے کھانے کے بعد حج کو جایا کرتی ہے مگر مکے سے آنے کے بعد بلی ہی رہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے میر نے یہ شعر کسی بلے کے متعلق کہا تھا۔

مکے گیا، مدینے گیا، کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا

بلی کو خواب میں صرف ایک چیز نظر آیا کرتی ہے۔ یعنی چھچھڑے۔ شیر سے مشابہ ہونے کی وجہ سے بلی شیر کی خالہ کہلاتی ہے مگر بھانجے نے اس رشتے کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ بلی کسی کے سامنے سے ہو کر گزر جائے تو لڑائی جھگڑا کا شگون ہوتا ہے۔ آج کل بنگلہ دیش میں بلی ہر لیڈر کے سامنے سے ہو کر گزر رہی ہے۔

کتا

عجیب و غریب جانور ہے۔ اسے راج بٹھایا جائے تو چکی چاٹنے آتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے اسے گھی ہضم نہیں ہوتا۔ اگر اس کی دم کو بارہ برس نلکی میں رکھا جائے پھر بھی وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتی ہے، اس لیے اس نلکی میں رکھنے کی بجائے اس پر استری کر لینا چاہیے۔ کتے کی جب موت آتی ہے تو مسجد کی طرف بھاگتا ہے، لیکن چونکہ آج کل لوگ مسجدوں میں نہیں جاتے۔ اس لیے صاف بچ جاتا ہے، اس کی مادہ کو کتیا کہتے ہیں۔ اس عورت کو بھی کتیا کہتے ہیں جو ہر نوجوان کے عشق کا دم بھرتی ہے۔

کتا آدمی سے زیادہ وفادار ہوتا ہے۔ اسی لیے ایک سمجھ دار شخص آدمی کی بہ نسبت کتے کی زیادہ قدر کرتا ہے۔ کتے کا واحد کام بھونکنا ہوتا ہے۔ البتہ جب وہ بھونک بھونک کر تھک جاتا ہے تو لوگوں کو کاٹنے لگتا ہے۔

چوہا

خاکی رنگ کا ایک بے وقوف جانور ہے۔ زمین میں بل بنا کر رہتا ہے۔ بل میں سانپ گھس کر اسے چٹ کر جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جان کے علاوہ گھر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ چوہے دن میں گوشت کے ٹکڑے کی خوشبو سونگھ کر بے قرار ہو جاتا ہے اور بن آئی موت مرنے کے لیے

اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی بے وقوفی کا ایک اور نمایاں ثبوت یہ ہے کہ اگر اس کے ہاتھ ہلدی کی گرہ لگے تو پنساری بن بیٹھتا ہے۔ کچھ چوہے اتنے احمق ہوتے ہیں کہ خود تو بل میں نہیں سماتے لیکن دم سے چھاج باندھ لیتے ہیں۔ چوہے کے دانت بڑے تیز ہوتے ہیں جن کا یہ ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ کتابوں اور کپڑوں کو کتر ڈالتا ہے۔ آج کل اتنے چوہے گھروں میں نہیں رہتے جتنے کھیتوں میں رہتے ہیں۔ آدمی کے بعد چوہا اناج کا سب سے بڑا دشمن ہے!۔

گدھا

ایک اور بے وقوف جانور ہے، یہ اتنا بے خبر ہوتا ہے کہ زعفران کا بھاؤ تک نہیں جانتا۔ ایک لحاظ سے بڑا خوش قسمت بھی ہے کیونکہ ضرورت پڑنے پر اسے باپ بنا لیتے ہیں۔ گدھا ہر جگہ پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ کابل میں بھی، بلکہ وہاں بڑے قابل گدھے پائے جاتے ہیں۔ کابل کے علاوہ تقریباً ہر دفتر میں اس سے ملاقات کی جا سکتی ہے۔ وہاں وہ ڈھیچوں ڈھیچوں نہیں کرتا، لیکن باتیں اور حرکتیں ایسی کرتا ہے کہ اس کو فوراً پہچان لیا جاتا ہے۔ گدھا کمہاروں اور دھوبیوں کے لیے بڑے کام کا جانور ہے۔

گیدڑ

ایک جانور جسے دور سے دیکھا جائے تو کتا نظر آتا ہے، لیکن نزدیک سے دیکھے جانے پر کتے کا چچازاد بھائی لگتا ہے۔ بڑا بزدل جانور ہوتا ہے۔ حملہ کرنے کی بجائے بھبکی سے کام لیتا ہے۔ اکثر دوسروں کا شکار کرنے کی بجائے فوراً ان کا شکار ہو جاتا ہے..... جب اس کی شامت آتی ہے تو شہر کا رخ کرتا ہے اور اچھی طرح پٹنے کے بعد پھر جنگل کی راہ لیتا ہے۔ اسے رات کو نیند نہیں آتی اس لیے دوسرے گیدڑوں کے ساتھ مل کر چلاتا ہے تاکہ لوگوں کی نیند حرام کر سکے۔

لومڑی

ایک جانور جو قریباً بلی کے برابر ہوتا ہے، لیکن جو بلی سے اتنا ہی مختلف ہوتا ہے، جتنا بلی اس سے ہوتی ہے۔ اس کی عیاری اور مکاری ضرب المثال ہے۔ یہ دوسرے جانوروں کو بہکانے میں

مشاق ہوتی ہے حتیٰ کے کئی بار شیر اور ہاتھی کو بھی الو بنا کر چھوڑتی ہے۔ میٹھی میٹھی باتیں کرنا اور طرح طرح کے سبز باغ دکھانا اس کا شغل ہوتا ہے کہ کسی شاعر نے اس کے متعلق کہا ہے۔

وہی لہجہ وہی تیور قسم ہے جھوٹے وعدوں کی
ذرا بھی شک نہیں ہوتا کہ یہ جھوٹی تسلی ہے

شیر

کبھی جنگل کا راجہ کہلاتا تھا۔ آج کل صرف سرکسوں اور چڑیا گھروں میں دیکھا جاتا ہے۔ تیرنے میں اسے کمال حاصل ہے تبھی تو استاد ذوق کو کہنا پڑا!

شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں

اسے منہ دھونے سے بہت نفرت ہے، اس لیے عموماً نہ صرف ناشتا بلکہ لنچ اور ڈنر بھی منہ دھوئے بغیر کرتا ہے۔ عموماً اس کا ایک بچہ ہوتا ہے کیونکہ یہ خاندانی منصوبہ بندی میں یقین رکھتا ہے۔ اس کا بچہ بھی شیر ہی کہلاتا ہے۔ ملاحظہ ہو انیس کا مصرع

شیروں کے پسر شیر ہی ہوتے ہیں جہاں میں

انسان اس کا اور یہ انسان کا شکار کرتا ہے۔ جو شکاری اس کا شکار ہونے سے بچ جاتے ہیں، وہ شیر کو ایک نہایت شریف جانور سمجھتے ہیں لیکن جنہیں یہ ایک آدھ ہاتھ دکھاتا ہے وہ اسے دور سے ہی سلام کرنے میں خیریت سمجھتے ہیں۔

ہاتھی

وہ واحد جانور ہے جس کا پاؤں اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس میں سب کے پاؤں آ جاتے ہیں۔ ایک اور لحاظ سے یہ بڑا خوش نصیب واقع ہوا ہے۔ اس کے پاس دانتوں کے دو سیٹ ہوتے ہیں ایک کھانے کے لیے دوسرا دکھانے کے لیے۔ ہاتھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بھورے اور سفید۔ سفید ہاتھی پالنے سے گریز کرنا چاہیے، کیونکہ جو اسے پالتا ہے اس کا دیوالیہ پٹ جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہاتھی امیروں کے دروازوں پر جھوما کرتے تھے۔ آج کل چونکہ امیر موٹر کار کو ہاتھی پر ترجیح دیتے ہیں اس لیے ہاتھی جنگلوں میں بیکار گھوما کرتے ہیں۔ ہاتھ اور ہاتھی میں زمین آسمان

کا فرق ہے۔ اس لیے جب کبھی کوئی کاتب ہاتھ کی بجائے ہاتھی لکھ دیتا ہے تو نہایت مضحکہ خیز صورت پیدا ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر

عشق بتاں میں دست دعا کس طرح اٹھائیں
پتھر تلے ہے ہاتھی ہمارا دبا ہوا

مور

یہ ہمارا قومی پرندہ ہے۔ اس کے پر بڑے خوبصورت مگر پاؤں بڑے بدنما ہوتے ہیں۔ جب یہ اپنے پاؤں کو دیکھتا ہے تو رو دیتا ہے۔ بے وقوف کہیں کا! خدا نے اسے بدصورت پاؤں اس لیے دیئے ہیں تاکہ اسے نظر نہ لگ جائے۔ یہ ہمیشہ جنگل میں ناچتا ہے تاکہ اس کے ناچ کو اس کے سوا کوئی نہ دیکھ سکے۔ مور اور چکور میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ چکور چاند کا عشق ہوتا ہے۔ مور اپنی مورنی کے سوا کسی سے عشق نہیں کرتا، حالانکہ وہ اس سے کم خوبصورت ہے۔ مور کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ اسی خدا نے اسے بنایا ہے، جس نے گدھ اور کوے بنائے۔

الو

ویرانوں میں رہتے ہیں اور بستیوں میں بھی۔ موخر الذکر کو ادب، موسیقی اور مصوری سے خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے۔ الو کو ہمیشہ بے وقوف سمجھا جاتا ہے مگر اس کی بیوقوفی کی مثال پیش نہیں کی جاتی۔ ہماری رائے میں جہاں تک بے وقوفی کا تعلق ہے، بیشتر آدمی الو سے کہیں بڑے الو ہوتے ہیں۔ الو کو منحوس سمجھا جاتا ہے حالانکہ الو دولت کی دیوی لکشمی کی سواری ہے اور بقول ایک سنسکرت شاعر، جب تک آدمی الو یا کاٹھ کا الو نہ ہو اس سے پاس لکشمی آتی ہی نہیں۔ الو کو آدمی نہیں بنایا جا سکتا۔ البتہ آدمیوں کو الو بنایا جا سکتا ہے اور بنایا گیا ہے۔ اگر کسی شخص کو بیٹھے بیٹھے الو بننے کا شوق ہو تو وہ اس محاورے کو یاد رکھے۔ ''چلو میں الو ہوتا''۔

کوا

کائیں کائیں کرنے کے علاوہ اسے کچھ نہیں آتا۔ جو لوگ ضرورت سے زیادہ بکواس کرتے ہیں، وہ عموماً اسے کھا کر آتے ہیں۔ جب یہ ہنس کی چال چلنے کی کوشش کرتا ہے تو اپنی بھی

بھول جاتا ہے۔ زمانہ ماضی میں یہ بڑا سادہ لوح ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ جب اس کے منہ میں گوشت کا ٹکڑا ہوتا جسے دیکھ کر لومڑی کے منہ میں پانی بھر آتا۔ وہ اس سے گانے کی فرمائش کرتی۔ یہ گانے کے لیے منہ کھولتا۔ گوشت کا ٹکڑا نیچے گر پڑتا اور اسے جھٹ لومڑی کھا جاتی۔ آج کل کافی چالاک ہو گیا ہے اس لیے گوشت کا ٹکڑا کھانے کے بعد لومڑی کو بتاتا ہے کہ اسے گانا بالکل نہیں آتا، وہ تو صرف کائیں کائیں کر سکتا ہے۔

بلبل

عجیب پرندہ ہے مذکر بھی ہے اور مونث بھی۔ شاعر اس کی آواز کی تعریف کرتے ہیں اور اسے پھول کا عاشق سمجھتے ہیں۔ اس کے ساتھ اردو شاعری کے بہت سے موضوعات وابستہ ہیں۔ جیسے قفسِ آشیانہ، صیاد، باغباں وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے متعلق بہت خوبصورت شعر کہے گئے ہیں، جنہیں اردو شاعری سے نکال دیا جائے تو باقی جو رہ جائے گا وہ اردو نثر ہو گی۔

کوئل

اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور یہ آم کے موسم میں باغوں میں پائی جاتی ہے۔ باغوں کے علاوہ ٹھمریوں اور دادروں میں کثرت سے ملتی ہے۔ اس کی کوک بڑی جاں گداز ہوتی ہے اور جو لوگ ہجر کے صدمے اٹھا رہے ہوں، ان کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ خدا نے اسے جیسی آواز دی ہے، ایسے خوبصورت اور اجلے پر بھی دیتا، تو یہ سونے پر سہاگہ ہوتا۔ مگر افسوس۔ خدا نے اجلے پر بگلے کو دیئے ہیں جو گانا تو کجا رونا بھی نہیں جانتا۔ کوئل برسات میں چپ سادھ لیتی ہے۔ اگر اس سے پوچھا جائے ایسا کیوں کرتی ہو، جواب دیتی ہے اب چاروں طرف مینڈک ٹرانے لگتے ہیں، اب ہمیں کون پوچھتا ہے۔

پپیہا

فلمی شاعروں کا محبوب پرندہ ہے۔ برہا کے ہر گیت میں اس کا ذکر آتا ہے۔ فلمی شاعروں کے نزدیک اس کی تخلیق ہی اس لیے کی گئی تھی کہ جب انہیں گیت لکھنے کے لیے کوئی موضوع نہ

سوجھے اس پر گیت لکھ دیں۔ یہ اپنی سریلی آواز سے پی کہاں پی کہاں بولتا ہے۔ کہیں خود چھپوں میں چھپا رہتا ہے۔ دراصل یہ "پی" کو آنکھ مچولی کھیلنے کے لیے مدعو کرتا ہے۔ اس کی آواز سن کر وہ دوشیزائیں جن کی کسی وجہ سے شادی نہیں ہو سکی، سمجھتی ہیں یہ ان کے زخموں پر نمک چھڑک رہا ہے اور انہیں ستانے کے لیے پی کہاں پی کہاں کی رٹ لگاتا ہے۔

بٹیر

بٹیر کو اہل لکھنؤ مذکر اور اہل دہلی مونث سمجھتے ہیں۔ ان دونوں کو کبھی توفیق نہ ہوئی کہ ایک کمیشن مقرر کر کے اس کی جنس یا سیکس کے مسئلہ کو طے کر لیتے۔ جو زمانہ اودھ کے نوابوں کے زوال کا ہے وہی بٹیر کے عروج کا ہے۔ جب نواب لد گئے، بٹیر یتیم ہو گئے۔ آج کل انہیں لڑانے کے لیے نہیں کھانے کے لیے پکڑتے ہیں۔ ایک لال بجھکو نے اسے پکڑنے کا یہ طریقہ بتایا تھا۔ آدمی اس کے سامنے کھڑا ہو جائے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دو ایک منٹ کھڑا رہے۔ یک لخت پسی ہوئی لال مرچیں اس کی آنکھوں میں ڈال دے۔ یہ فوراً اندھا ہو جائے گا، بس اسی وقت اسے قابو کر لے۔

مینا

واحد پرندہ ہے جسے ولی یا صوفی کہا جا سکتا ہے۔ بکری کے برعکس جو میں میں کرتی ہے اور اپنا گلا کٹواتی ہے۔ یہ میں نہ میں نہ کرتی ہے۔ اور سب کو پیاری لگتی ہے۔ ہندی کے کسی شاعر نے ٹھیک کہا ہے

مینا جو میں نہ کہے دودھ بھات نت کھائے
بکری جو میں میں کرے کھال روز کھنچوائے

مرغ

بڑا کارآمد پرندہ ہے۔ جب بانگ دیتا ہے تب صبح ہوتی ہے۔ کئی بار لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے آدھی رات کو بانگیں دینے لگتا ہے، خاص کر جب چاندنی رات ہو۔ آج کل اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ لوگ اسے خرید کر نہیں چرا کر پکاتے ہیں۔ اس کا اگر ایک آدھ انگ خراب بھی ہو

تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بقول شاعر

گو پڑوسن کا مرغ ہے لنگڑا
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

طوطا

واحد پرندہ ہے جو اپنی بولی کے علاوہ انسان کی بولی بول سکتا ہے۔ انسان کے علاوہ سب سے بڑا طوطا چشم ہے۔ معلوم ہوتا ہے گھونسلے کی بجائے یہ کبھی کبھی ہاتھوں میں بھی رہتا ہے۔ چنانچہ جونہی کوئی شخص حواس باختہ ہوتا ہے اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ آج کل بہت سے طلبہ طوطے کی طرح سبق رٹ لیتے ہیں۔ آج کل انہیں طلبہ کی بجائے گنگا رام یا میاں مٹھو کہنا چاہیے۔

☆☆☆

بالغوں کے لیے تیسری کتاب

تاریخ کا ایک سبق

آریہ لوگ

کچھ مورخ کہتے ہیں آریہ لوگ وسطی ایشیا سے ہندوستان میں آئے۔ کچھ اور سمجھتے ہیں وہ اسی ملک کے باشندے تھے۔ اگر وہ یہاں ہی کے رہنے والے تھے تو یہ ان کی خوش قسمتی تھی کیونکہ وہ اس طویل سفر کو طرے کرنے سے بچ گئے جو انہیں وسطی ایشیا سے ہندوستان میں آنے کے لیے کرنا پڑتا۔ آریہ لوگ گورے رنگ، لمبے قد اور خوبصورت خدوخال کے مالک تھے۔ ان کے موجودہ جانشینوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے۔ ''خدا جانے یہ بھلے مانس کس پر گئے ہیں''..... کیونکہ لفظ آریہ کے معنی ہیں۔ نیک شریف اور مہذب۔ یورپین مورخین کے نزدیک آریہ لوگ بڑے ذہین تھے۔ یقیناً ان کی یہ رائے ذہانت پر مبنی ہے کیونکہ وہ خود بھی آریہ ہی ہیں۔ آریہ لوگ عادتاً اور طبعاً نہایت شکر گزار واقع ہوئے تھے۔ جو چیز یا شخص ان کے لیے کچھ بھی کرتا، اسے دیوتا سمجھ لیتے تھے۔ سورج ان کے لیے دیوتا تھا کہ وہ سارا سال روشنی مہیا کرتا تھا لیکن بجلی کے محکمہ کے

برعکس کبھی بجلی کا بل نہیں بھجواتا تھا۔ چاند اس لیے دیوتا تھا کہ وہ سورج سے روشنی مستعار لے کر دھرتی کے باسیوں میں مفت تقسیم کرتا تھا۔ سانپ اس لیے دیوتا تھا کہ وہ فصل کو تباہ کرنے والے چوہوں کو کھا جاتا تھا۔ اس زمانہ کے آریہ لوگ آج کل کے لوگوں سے مختلف تھے۔ آج کل تو لوگوں کا اصول ہے، جو شخص بھی تمہارے کسی کام آئے، موقع ملتے ہی اس کا کام تمام کر دو۔ آریہ لوگ صرف ایک خدا کی پرستش کرتے تھے۔ جہاں ہمارا مقصد زیادہ روپیہ کمانا ہے وہاں آریا لوگوں کا سب سے بڑا مقصد انسان بننا تھا۔ موجودہ دور کا آدمی سب کچھ بننا چاہتا ہے لیکن خدا جانے انسان کیوں نہیں بننا چاہتا۔ آریوں کے نزدیک انسان بننے کا یہ نسخہ تھا کہ..... آدمی الو، بھیڑیے، کتے اور گدھ کے طور طریقوں کو ترک کر دے لیکن افسوس آج کل ہم یہ طور طریقے اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ الو کی طرح ہمیں تاریکی یعنی جہالت سے نفرت نہیں ہے، بھیڑیے کی طرح ہم روز بروز سفاک بنتے جا رہے ہیں، کتے کی طرح ہم نفس کے غلام بن گئے ہیں اور گدھ کی طرح ہمیں مردار پر جھپٹنے کی عادت پڑ گئی ہے۔

مہاتما بدھ

ہندوستان اور ایشیا کے ہی نہیں دنیا کے پہلے مہاتما تھے۔ انہوں نے مورتی پوجا کے خلاف جہاد کیا۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ان کی وفات کے بعد سب سے زیادہ مورتیاں انہی کی بنائی گئیں۔ چنانچہ آج کل جہاں بھی کھدائی ہوتی ہے، وہاں سے کچھ اور نکلے نہ نکلے بدھ کی ایک آدھ مورتی ضرور برآمد ہوتی ہے۔ انہوں نے نجات حاصل کرنے کا یہ طریقہ دریافت کیا کہ آدمی تمام خواہشوں سے نجات حاصل کر لے۔ بظاہر بڑا آسان طریقہ ہے۔ لیکن اس پر عمل تب تک نہیں کیا جا سکتا جب تک آدمی خود مہاتما بدھ نہ ہو۔ انہوں نے جس مذہب کی بنیاد ڈالی، وہ ہندوستان کا واحد مذہب ہے جسے کئی ممالک میں برآمد کیا گیا کہ وہ ہندوستان میں بہت کم رہ گیا۔ اس مذہب کے اصولوں پر عمل کیا جائے تو آدمی بار بار پیدا ہونے اور بار بار مرنے سے بچ جاتا ہے۔ لیکن دور حاضرہ کے انسان کو بار بار پیدا ہونے اور مرنے کا چسکا پڑ گیا ہے، اس لیے وہ بدھ مذہب کے سنہرے اصولوں پر عمل نہیں کرنا چاہتا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسان وہ ڈھیٹ جانور ہے جسے راہ راست پر نہیں لایا جا سکتا۔

سکندر اعظم

ارسطو کا شاگرد تھا۔ لیکن فلسفی بننے کی بجائے فاتح بن گیا۔ اس کا نصب العین ساری دنیا کو فتح کرنا تھا۔ ایک بار وہ زار و قطار رونے لگا کہ دنیا صرف ایک ہے اور بہت چھوٹی ہے۔ وہ اسے بہت جلد فتح کر لے گا اور پھر اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں رہے گا۔ سکندر اعظم نے دو بڑی غلطیاں کیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کو فتح کرنے کی اس کی تمنا پوری نہ ہوئی اور اسے قبل از وقت زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ پہلی غلطی یہ تھی کہ وہ اپنے سپاہیوں کو ان کے وطن سے اتنی دور لے آیا کہ انہیں بیوی بچوں کی یاد ستانے لگی اور انہوں نے آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ دوسری غلطی یہ تھی کہ ہندوستان پر حملہ کرتے وقت وہ اپنے ساتھ کونین کی گولیاں لانا بھول گیا۔ چنانچہ جب ہندوستان سے اپنے وطن کی جانب روانہ ہوا، راستے میں ملیریا ہو گیا اور 33 سال کی عمر میں چل بسا۔

ارسطو نے فلسفے کے جو سبق اسے پڑھائے تھے، وہ اسے بستر مرگ پر یاد آئے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ اس کا جنازہ لے جاتے وقت اس کے دونوں ہاتھ کفن سے باہر خالی دکھائے جائیں اور اس کی قبر پر یہ الفاظ کندہ کیے جائیں۔

''اس قبر میں سکندر اعظم آرام کر رہا ہے۔ آج وہ چھ فٹ زمین سے مطمئن ہے۔ لیکن جب وہ زندہ تھا، اس کے لیے ساری دنیا کی زمین ناکافی تھی''۔

اشوک

اشوک کے معنی ہیں وہ شخص جو شوک یعنی غم سے مبرا ہو۔ صحیح معنوں میں اشوک تب اشوک بنا جب اس نے جنگ کرنے سے توبہ کی اور بدھ مذہب اختیار کیا۔ سکندر اعظم کی طرح اشوک نے بھی دو غلطیاں کیں۔ پہلی یہ کہ اپنے وقت سے کم از کم پانچ ہزار سال پہلے پیدا ہو گیا، اس لیے لوگ اس کی امن پالیسی کی وہ قدر نہ کر سکے جس کی وہ مستحق تھی۔ دوسری غلطی یہ کہ جو ستون اور ستوپے اس نے نصب کیے، ان پر اپنے فرمان راشٹر بھاشا ہندی میں نہیں لکھوائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اشوک کے بعد آنے والی نسلیں انہیں پڑھ نہ سکیں اور ان پر عمل نہ کر سکیں۔ اشوک مجسم

یو۔این۔او تھا۔ وہ دنیا سے جنگ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہتا تھا۔ وہ صرف ایک جنگ کی ہولناکیوں کو دیکھ کر تھرا اٹھا۔ اگر وہ اس قیامت کو دیکھتا جو آج کل جنگ برپا کرتی ہے، وہ جنگ سے توبہ کرنے کے بجائے تاج وتخت سے دست بردار ہو جاتا اور سنیاس لے لیتا۔ ہندوستان کی تاریخ میں وہ واحد بادشاہ ہے جو بادشاہ ہونے کے باوجود عقل مند تھا۔ اس نے مہاتما بدھ کے اصولوں کو عملی جامہ پہنایا۔ اس میں اور بدھ میں وہی تعلق تھا جو لینن اور کارل مارکس میں تھا۔ اشوک کے کارنامے پڑھ کر یہ خیال آتا ہے کہ اگر دنیا میں اشوک زیادہ اور چنگیز خاں کم ہوتے یا بالکل نہ ہوتے تو دنیا کی تاریخ کتنی مختلف ہوتی۔

محمود غزنوی

اس کو ہندوستان پر حملہ کرنے کا لپکا یا چسکا پڑ گیا تھا۔ آئے سال غزنی سے ہندوستان میں آتا اور لوٹ مار کرنے کے بعد واپس چلا جاتا۔ ہندوستانیوں نے اسے کبھی منع نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا خود ہی تھک ہار کر حملے بند کر دے گا۔ چنانچہ ہوا بھی یہی۔ ستارہواں حملہ کرنے کے بعد اس کی ہمت نے اسے جواب دے دیا اور اس نے مزید حملے کرنے سے توبہ کر لی۔ محمود نے سالم ہندوستان پر حکومت کرنے کی کوشش نہیں کی، کیونکہ وہ جانتا تھا ہر حکمران کو کچھ عرصہ بعد اس نعرہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے

مانگ رہا ہے ہندوستان
روٹی کپڑا اور مکان

روایت ہے۔ جب محمود نے سومناتھ کے مندر پر حملہ کیا، پجاریوں نے اسے خوبصورت مورتی کو نہ توڑنے کے لیے معقول رقم پیش کی لیکن اس نے اسے ٹھکراتے ہوئے کہا۔ ''میں بت شکن ہوں، بت فروش نہیں''۔ اس بت نے محمود سے یہ انتقام لیا کہ اسے ایک بت کی محبت میں جس کا نام ایاز تھا، گرفتار کرا دیا۔ چنانچہ وہ اس سے عمر بھر چھٹکارا حاصل نہ کر سکا اور اس کی بے کسی کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی شاعر کو کہنا پڑا

توحید پہ ناز اتنا دل محو ایاز اتنا
تو زرا نہ گیا تجھ سے محمود یہ بت خانہ

محمد غوری

یہ خاندان غور سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے غور وخوض کرنے کی عادت تھی۔ چنانچہ غور وخوض کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی ملک کو فتح کرنے کے لیے جانباز سپاہوں یا فوجی ساز وسامان کی اتنی ضرورت نہیں، جتنی اس ملک کے غداروں کا تعاون حاصل کرنے کی۔ چنانچہ اس نے ہندوستان کے ایک فرسٹ کلاس غدار جے چند کے ساتھ ساز باز کر کے پرتھوی راج کو شکست دی۔ اس کے بعد اس نے جے چند کی ریاست پر حملہ کر دیا۔ جب جے چند نے اس سے بے وفائی اور وعدہ شکنی کی شکایت کی تو اس نے کہا۔

''جو شخص اپنے بھائی کو دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ دوسروں کو کس طرح دھوکا نہ دے گا۔ پھر عزیز من! یہ جنگ ہے، اس میں سب کچھ جائز ہے''۔

قطب الدین ایبک

یہ وہ غلام تھا جس نے لاکھوں ہندوستانیوں کو غلام بنایا اور خاندانِ غلامان کی بنیاد ڈالی۔ یہ ہندوستانیوں کی خصلت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا ہندوستانی خود حکومت کرنے کی بجائے غیروں کو حکومت کرنے کا موقع دیتے ہیں تاکہ ہر قسم کی ذمہ داری سے بچ جائیں۔ قطب الدین ایبک کا سب سے بڑا کارنامہ قطب صاحب کی لاٹھ ہے۔ کچھ مورخ سمجھتے ہیں یہ لاٹھ دراصل ایک ٹیلی ویژن ٹاور کے طور پر بنائی گئی تھی۔ لیکن جب قطب الدین کو بتایا گیا کہ طلبہ ٹیلی ویژن پر چترہار دیکھا کریں گے، تو اس نے ٹیلی ویژن رائج کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ قطب الدین لاہور میں چوگان کھیلتے وقت گھوڑے سے گرا اور اس کی موت ہو گئی۔ کہتے ہیں مرتے وقت اس نے خدا کا شکر کیا کہ بادشاہ ہونے کے باوجود قدرتی موت مر رہا ہے۔ اس کی قبر لاہور کی ایک تنگ گلی میں جو کہ انارکلی بازار سے نکلتی ہے، واقع ہے۔ حالانکہ اسے مرے ہوئے 767 برس ہو گزرے ہیں، اسے ابھی تک مقبرہ نصیب نہیں ہوا۔

علاؤالدین خلجی

پہلا غیر ہندوستانی تھا، جس نے سارے ہندوستان پر حکومت کی۔ کہتے ہیں وہ خود الہ دین تھا لیکن اپنے آپ کو علاؤالدین اس لیے کہتا تھا تا کہ اسے نظر نہ لگ جائے۔ اس نے اس وقت کے ہندوستان کے ہر راجہ کو شکست دی لیکن اسے ایک رانی نے شکست دے کر ہندوستان کی لاج رکھ لی۔ اس رانی کا نام رانی پدمنی تھا۔ کہتے ہیں جب اسے حاصل کرنے لیے وہ چتوڑ کے قلعے میں داخل ہوا، اسے پدمنی کی راکھ کے سوا کچھ نہ ملا۔ اس کی ساری حسرتیں خاک میں مل گئیں کیونکہ راکھ زبان حال سے کہہ رہی تھی

اٹھ گیا وحشی لگا کر قہقہہ
دیر تک محفل میں سناٹا رہا

علاؤالدین نے دہلی میں حوض خاص بنوایا حالانکہ اس سے توقع کی جاتی تھی کہ دیوان خاص بنوائے گا۔ اس نے حوض عام کہاں بنوایا اس کا پتا نہیں چل سکا۔ معلوم ہوتا ہے اس نے دریائے جمنا کا نام حوض عام رکھ دیا تھا۔

اکبر

چھ بڑے مغل بادشاہوں میں اکبر سب سے بڑا تھا اور جتنا بڑا تھا اتنا ہی ان پڑھ تھا اور جتنا ان پڑھ، اتنا ہی کامیاب منتظم اور حکمران تھا۔ اس نے ہندوستان میں سب سے پہلے ''سیکولر ڈکٹیٹرشپ'' کی بنیاد رکھی۔ ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے کے لیے راجپوت گھرانوں میں شادیاں کیں لیکن اس سے ہندو مسلم اتحاد کو کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ کیونکہ یہ یک طرفہ ٹریفک تھا۔ اکبر نے نئے مذہب ''دین الٰہی'' کو رائج کرنے کی کوشش کی مگر اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی کیونکہ مذہب چلانے سے پہلے اس نے پیغمبر یا اوتار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ایسے دعویٰ کے بغیر ہندوستان میں نیا مذہب چلایا نہیں جا سکتا۔ غلاموں کے علاوہ اکبر مسخروں کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مسخرہ وہ درباری ہوتا ہے جس پر چاپلوس ہونے کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی۔ اکبر نے ہندوستان کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت بنانے کے لیے پچاس سال صرف کیے۔ اورنگ زیب نے قریب قریب اتنے ہی برس اس سلطنت کے پرخچے اڑانے میں لگائے۔

☆☆☆

اور ابلیس نے کہا

اور وہ ایک چبوترے پر کھڑا ہو گیا اور اس نے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا: میں خدا کا دوست ہوں نہ اس کا بیٹا، میں خدا کا اوتار بھی نہیں۔

میں تو اس کا دشمن ہوں، میں خدا کی رحمت سے مایوس ہوں، لیکن انسان کی شفقت سے کبھی محروم نہ رہا۔

خدا نے مجھے دھتکارا، انسان نے سر آنکھوں پر بٹھایا، مجھے فخر ہے کہ انسان نے ہمیشہ میرے پیغام کو پیغمبروں کے پیغام پر ترجیح دی۔

تم میرا وعظ سنو۔

میں کہتا ہوں خوش قسمت ہیں امیر کہ زمین کی بادشاہت ان کی ہے۔ سچ پوچھو تو آسمان کی بادشاہت بھی انہی کی ہے۔

خوش نصیب ہیں امیر کہ انہیں اس دنیا میں حور و غلماں دستیاب ہیں اور وہ فرانسیسی وہسکی کے جام لنڈھاتے ہیں۔ غربا کی طرح تاڑی اور ٹھرا نہیں پیتے۔

قابل رشک ہیں امیر کہ وہ روپے سے ہر ایک چیز خرید سکتے ہیں۔ چاہے وہ چیز کسی راہنما کا ضمیر ہو یا کسی خاتون کی عصمت۔

نہایت دانش مند ہیں امیر کہ غربا پر لعنت بھیجتے ہیں اور بڑے سادہ لوح ہیں غریب کہ سمجھتے ہیں کہ ان کی زبوں حالی کے لیے امیر ذمہ دار نہیں۔

قابل مذمت ہیں غریب کہ جن کے خیال میں سب سے بڑی دولت صبر، سب سے بڑا آسرا قسمت اور سب سے بڑی عیاشی فٹ پاتھ پر سونا ہے۔ بہت چالاک ہیں سرمایہ دار کہ اشتراکیت کا مذاق اڑاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ پرولتاریوں کی حکومت میں ان کی دال نہ گلے گی۔

بڑے عجیب ہیں غریب کہ جنہیں دنیا سے زیادہ عاقبت کی فکر ستاتی ہے اور تم سے کہا گیا خدا تمہارا آسمانی باپ ہے، اس کی اطاعت قبول کرو۔

لیکن آفرین کہ تم گمراہ نہیں ہوئے اور تم نے روپے کو ہی آسمانی باپ سمجھا۔

اور تمہیں یہ سبق پڑھایا گیا کہ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ رسید کرے تو اسے اپنا

دوسرا گال بھی پیش کردو، لیکن تم نے اس قسم کی فراخ دلی دکھانے کی کبھی غلطی نہیں کی۔ تم نے اس کے گال پر زناٹے سے وہ تھپڑ رسید کئے کہ آئندہ اس کی جرات نہیں ہوئی کہ تم پر ہاتھ اٹھا سکے۔

اور تمہیں بار بار یہ تلقین کی گئی تم اپنے نفس امارہ کو مارنے کی کوشش کرو، لیکن تم نے دیکھا ایسا کرنا کتنا مشکل ہے۔ بس اسے آئندہ مارنے کی بجائے زندہ رکھنے کی کوشش کرو۔

اور تمہیں سمجھایا گیا، گناہوں سے توبہ کرو نہیں تو خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ تو تم ان سے کہو اول تو ہم خدا کو منہ نہیں دکھائیں گے اور اگر دکھانا پڑا تو منہ پر نقاب ڈال لیں گے۔

اور تمہیں بتایا گیا کہ کسی پر تنقید مت کرو، تاکہ کوئی تم پر تنقید نہ کرے، لیکن میں کہتا ہوں محض اس ڈر سے کہ کوئی تم پر تنقید کرے گا، اس دل چسپ شغل کو ترک مت کرو۔ البتہ جب تم پر کوئی تنقید کرے تو ایسا دنداں شکن جواب دو کہ وہ بغلیں جھانکنے لگے۔

تم سے اکثر کہا گیا بری بات مت دیکھو، مت سنو، مت کہو۔ یعنی آنکھیں، کان اور زبان رکھتے ہوئے بھی تم اندھے، بہرے اور گونگے مت بن جاؤ۔ تم خود ہی سوچو یہ مشورہ کتنا مضحکہ خیز ہے۔

اور تمہیں بار بار ابدیش دیا گیا کام، کرودھ، لوبھ، موہ اور ہنکار تمہارے دشمن ہیں۔ ان سے چھٹکارا پانے کی ہر ممکن کوشش کرو، لیکن تم نے کبھی سوچا کہ ان سے نجات حاصل کرنے کے بعد انسان انسان نہیں رہتا بلکہ پتھر کی مورتی یا سنگ مرمر کا مجسمہ بن جاتا ہے۔

اور تم سے کہا گیا ہمسایوں سے محبت کرو، لیکن اگر ہمسائے لڑاکا، جھگڑالو اور بدطینت ہوں تو تم ان سے کس طرح محبت کر سکتے ہو۔

اور تمہیں نصیحت کی گئی بزرگوں کا احترام کرو، لیکن جب بزرگ ضرورت سے زیادہ باتونی، بدمزاج اور دقیانوس ہوں تو ان کی عزت کون کر سکتا ہے۔

اور تم نے پڑھا جہاں عورتوں کی پوجا کی جاتی ہے، وہاں دیوتا بستے ہیں اگر وہاں دیوتا بستے ہیں تو زن مرید خاوند کہاں جاتے ہیں۔

اور تمہیں بتایا گیا جب تم پر مصیبت آئے خدا کو پکارو، وہ تمہاری مدد کرے گا۔ تم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے اور تم نے خدا کو بار بار پکارا، یہاں تک کہ تمہارا گلا بیٹھ گیا، لیکن وہ نہیں آیا۔ پس آئندہ خدا کو پکارنا بند کرو اور نزدیک ترین پولیس اسٹیشن یا یتیم خانے کو اطلاع دو۔

اور تم مدت سے سن رہے ہو، ہو بہ مناسب سے بڑا دھرم ہے، لیکن جب تک قصاب اس مقولے پر

ایمان نہ لائے۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منا سکتی ہے اور تمہیں ہدایت کی گئی جھوٹ مت بولو۔ لیکن تجربے نے تمہیں بتایا کہ اگر سچ بولو گے تو بیوی ناراض ہو جائے گی، محبوبہ روٹھ جائے گی، دوست دشمن بن جائیں گے۔ اس لیے تم نے اچھا کیا کہ اتنے خطرے مول لینے کے بجائے سچ بولنا چھوڑ دیا۔

اور مطلع کیا گیا ہمیشہ دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کرو جس قسم کے سلوک کی تم ان سے توقع رکھتے ہو، لیکن چونکہ تم دوسروں کے باطن کا حال نہیں جانتے تھے، اس لیے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیسے کر سکتے تھے۔

اور تم سے کہا گیا خدا کی عبادت کرو، یتیموں اور بیواؤں کی مدد اور مریضوں اور غریبوں کی خدمت کرو۔ ظاہر ہے یہ تمام کام تم بیک وقت نہیں کر سکتے تھے، اس لیے تم نے کوئی کام بھی نہیں کیا۔

اور یہ دعویٰ کیا گیا جیو اور جینے دو۔ ایک سنہرا اصول ہے، لیکن تم جانتے تھے اگر تم نے دوسروں کو جینے دیا تو کچھ عرصے بعد وہ تمہیں جینے نہیں دیں گے۔ اس لیے تم نے انہیں جینے کا موقع ہی نہیں دیا۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو حقیقت کی دنیا میں رہتے ہیں اور جو انسان کو انسان نہیں بلکہ ایک نہایت مکار اور خون خوار جانور سمجھتے ہیں۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کا عقیدہ ہے کہ بندر، گھوڑے اور ریچھ کو سدھایا جا سکتا ہے لیکن انسان کو نہیں۔

پس تم مجھ پر ایمان لاؤ۔ میں تمہیں نجات تو نہیں البتہ بے پناہ دولت، خوبصورت عورتیں اور شراب دوں گا۔ یاد رکھو۔ مجھ سے پہلے اور میرے بعد کئی پیغمبر آئے، لیکن انسان کے طور طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ لا سکے کیونکہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ استرے کی تیز دھار پر چلنا، لیکن جس راستے پر چلنے کی میں تمہیں ترغیب دے رہا ہوں، اس پر چلنا اتنا ہے آسان ہے جتنا فرش مخمل یا پھولوں کے تختوں پر چلنا۔ تم کہو گے یہ راستہ ہمیں جہنم کے دروازے تک لے جائے گا۔ میں کہوں گا تم خوامخواہ خوف زدہ ہو رہے ہو۔ اول تو جہنم کس نے دیکھا ہے۔ اور بلفرض..... اگر واقعی جہنم کا وجود ہے تو وہ اس جہنم سے قطعاً مختلف ہوگا جس کا ذکر کتابوں میں آیا ہے۔ آخر خدا اتنا سنگدل نہیں ہو سکتا کہ ایک بار تمہیں جہنم میں جھونکنے کے بعد

پھر تمہاری سدھ بدھ نہ لے۔

اس لیے مجھ پر بھروسا رکھو۔ اور کھلے بندوں میری امامت قبول کرو ورنہ اگر تم ایسا نہیں کرو گے۔ تو یقیناً ریاکار کہلاؤ گے کیونکہ تم ایمان تو پیغمبروں پر لاتے ہو، لیکن دراصل دم میرا بھرتے ہو۔

☆☆☆

غالب کے اڑیں گے پرزے

باغ بہشت میں مرزا غالب اپنے محل میں ایک پرتکلف مسند پر بیٹھے دیوانِ غالب کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔ اچانک باہر سے نعروں کی آواز آتی ہے..... غالب کے..... اڑیں گے پرزے۔ غالب کے..... اڑیں گے پرزے۔ مرزا گھبرا کر لاحول پڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ یہ لوگ جنت میں بھی چین نہ لینے دیں گے۔ پھر خدمت گار کو حکم دیتے ہیں باہر جا کر پتا لگاؤ یہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ وہ خبر لاتا ہے کہ، غالب شکنوں، نے ایک جلوس نکالا ہے، جس کی راہ نمائی یاس یگانہ اور طباطبائی کر رہے ہیں اور یہ جلوس شہنشاہ سراج الدین ابوظفر کے محل کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اتنے میں، دیوان غالب، کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں پرزے فضا میں اڑتے ہوئے مرزا کے محل میں گرتے ہیں، وہ ان کو اٹھاتے ہیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ان پر ان کے اشعار کی علاوہ کچھ اور بھی لکھا ہے۔

..... کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے..... خوب! محبوب نہ ہوا مرغی ہوئی جو راکھ کریدرہی ہے۔ کریدتے کا لفظ یہاں کتنا غیر مناسب ہے (طباطبائی)۔۔۔ بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے۔

..... واہ صاحب واہ! خدا کا شکر کیجئے کہ بوجھ سر سے گر پڑا ہے، اب اسے پھر اٹھا کر گردن تڑوانے کا ارادہ ہے کیا؟..... پھر مجھے دیدہ تریاد آیا..... اجی صاحب! کس کا دیدۂ تر؟ اپنا؟ رقیب کا؟ یا محبوب کا؟..... سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا..... یک نہ شد دو شد۔ بھئی کس کا سر یاد آیا؟ مجنوں کا؟ اپنا؟ یا شیخ ابراہیم ذوق کا؟..... دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا..... کس کو دونوں جہان دے کر کون خوش رہا؟ یہ معما ہے یا مصرع؟..... شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے..... یہ بھی خوب رہی۔ بجھ شمع رہی ہے۔ اور دھواں "میں" سے نکل رہا

ہے (مجاز لکھنوی)..... ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد..... کیوں صاحب! اگر محروم حنا میرے بعد لکھ دیتے تو کیا حرج تھا..... یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب..... خدا لگتی کہیئے، اس غزل میں آپ نے تصوف کی کون سے رمز بیان کی ہے اور ہم آپ کو کیسے ولی سمجھ لیں۔ کیا تیر نیم کش میں تصوف سمویا گیا ہے یا مر کر رسوا ہونے میں؟..... کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب..... گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا..... وہ رقیب ہی کیا جس کے مقدر میں محبوب کی گالیاں لکھی ہوں۔ پھر آپ اور رقیب میں فرق ہی کیا رہا؟..... میں اور اندیشہ ہائے دور دراز..... یہ بھی بتا دیا ہوتا وہ اندیشہ ہائے دور دراز کیا ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے وہ اپنی زلفیں سنوارنے میں مصروف ہیں اور آپ انہیں نظر بھر کر دیکھ رہے ہیں۔ آئینے میں سہی!..... ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے..... یہ بات کیا بنی۔ اگر آساں نہیں تو سہل کیسے ہے؟..... اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے..... کیا ٹھانی ہے؟ کیا امراؤ بیگم کو طلاق دینے کا ارادہ ہے یا ستم پیشہ ڈومنی کو اغوا کرنا چاہتے ہیں..... نیند کیوں رات بھر نہیں آتی..... ظاہر ہے کہ مے نوشی کی وجہ سے آپ کا اعصابی نظام کمزور پڑ گیا ہے۔ نیند کیسے آئے؟..... موت آتی ہے پر نہیں آتی..... جب آتی ہے اسے روک کیوں نہیں لیتے؟..... لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں..... ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے..... ہاتھ قلم ہو جانے کے بعد کیا پیر سے لکھتے رہے۔ (طباطبائی)..... بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے..... کون کس کو اشارے کرتا رہا..... آپ؟ رقیب؟ یا محبوب؟

غالب ان گستاخانہ تبصروں کو پڑھ کر زیر لب مسکرائے ہیں۔ اب وہ چند اور پرزے ملاحظ فرماتے ہیں۔ ''غالب کے نزدیک شاعری ذہنی عیاشی کا بدل ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا، اپنے بارے میں لکھا۔ عمر بھر وہ غم عشق کا رونا روتے رہے۔ کاش انہیں معلوم ہوتا..... اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا''

''غالب نے جی بھر کر عشق کیا۔ عموماً خیالی محبوبوں سے، جس قدر ہے ملی ہر شب پیتے رہے۔ عموماً قرض کی۔ پھر انہیں شکایت رہی کہ ان کے ارمان بہت کم نکلے۔ اللہ اللہ کتنے بے صبر اور ناشکرے تھے وہ!''

غالب اس پرزے کو پڑھ کر خوب ہنستے ہیں اور اب ایک بہت بڑا پرزہ اٹھاتے ہیں ''وہ جسے ہم

انگریزی میں سٹریم آف کانشس نیس (Stream of consciousness) کہتے ہیں، مرز کی غزلوں میں رواں دواں ہے۔ مثال کے طور پر ان کی مشہور غزل لیجئے جس کا مطلع ہے:

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

ظاہر ہے ایام غدر میں وہ چاندنی چوک سے گزر رہے ہیں اور انہیں محسوس ہو رہا ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ان کی کسی امید کے بر آنے کا امکان نہیں۔ چاندنی چوک میں وہ سناٹا ہے کہ کہیں کوئی اچھی صورت نظر نہیں آ رہی۔ یک لخت ان کا خیال گوروں کے ہاتھ ہندوستانیوں کی پکڑ دھکڑ کی طرف جاتا ہے اور وہ پوچھتے ہیں جب مرنا برحق ہے تو پھر گوروں کے ڈر سے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔ گوروں سے ان کا تخیل اپنے شاگرد رشید مولانا الطاف حسین حالی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ حالی کو دل ہی دل میں جھڑک کر کہتے ہیں۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

پھر وہ سوچتے ہیں، یہ حالی بہت بڑا بور ہے، لیکن امراؤ بیگم نے مدت سے جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ کیوں نہ اسے ایک دن کھری کھری سنائی جائیں۔ پھر ڈرتے ہیں کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، اس لیے فرماتے ہیں:

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

چونکہ وہ نشہ میں ہیں۔ اس لیے انہیں مطلقاً علم نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔ اپنی مضحکہ خیز حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

معاً انہیں یاد آتا ہے کہ ظفر نے انہیں حج پر ساتھ لے چلنے کی پیش کش کی تھی، لیکن وہ رند شاہد باز ہیں، اس لیے ان کا حج قبول نہیں ہوگا۔ کف افسوس ملتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

کہیے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

اپنی غزل کی یہ تاویل سن کر مرزا ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہیں، لیکن اس سے اگلا پرزہ پڑھ کر ان کی ہنسی سنجیدگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ''غالب شاعر نہیں افسانہ نگار تھے۔ انہیں مختصر ترین افسانے لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے کچھ افسانے تو اپنے اختصار اور اپنی افسانویت کے باعث شاہکار کہے جا سکتے ہیں مثلاً:

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(نوٹ) اس افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق جن کے زہد کی دہلی میں دھوم ہے۔ کل چوری چھپے شراب پیتے پکڑے گئے۔ ایک اور افسانے میں انہوں نے پاسباں کے ہاتھوں اپنے پٹ جانے کے واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اور مندرجہ ذیل شعر تو ایک اچھے خاصے نفسیاتی ناول کا موضوع بن سکتا ہے:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اس سے اگلا پرزہ انہیں سر پیٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک وید مقدس۔ دوسرا دیوان غالب''۔ مرزا غالب نے اپنے بہترین اشعار میں وید منتروں کی بہت عمدہ تفسیر کی ہے۔ رگ وید میں ایک منتر آتا ہے جس کا مفہوم ہے انسان بنو۔ مرزا فرماتے ہیں:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اتھر وید کے ایک منتر میں تلقین کی گئی ہے کہ یہ دنیا مایا ہے۔ غالب نے اس خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

مرزا اپنا سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ دو ایک منٹ کے سکوت کے بعد کہتے ہیں ''توبہ توبہ۔ غالب اور ویدوں کا مفسر.....'' ''سفید جھوٹ کی اس سے بڑی مثال مشکل سے ملے گی۔ یا خدا! یہ میں نے کیا کیا۔ کیوں خواہ مخواہ بھینس کے آگے بین بجائی۔ یہ پرزے پڑھ کر تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے میرا دیوان ایک گورکھ دھندا ہے۔ ارے بھئی میاں مہدی حسین مجروح، شیفتہ، ہرگوپال تفتہ ذرا ادھر آؤ اور اپنی نکھوں سے دیکھو میرے دیوان کی کیا گت بنائی جا رہی ہے۔

یک لخت دروازے پر دستک ہوتی ہے اور اندر آنے کی اجازت ملنے پر منشی ہرگوپال تفتہ داخل ہوتے ہیں۔

''آداب عرض پیرومرشد! مبارک ہو۔ بہت بہت مبارک ہو''۔

''منشی ہرگوپال۔ دیکھ نہیں رہے ہو، میرے پرزے اڑائے گئے ہیں اور تم مبارک باد پیش کر رہے ہو، گویا میرے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو''۔

''پیرومرشد! میں جانتا ہوں جن گستاخ ہاتھوں نے آپ کے پرزے اڑائے اور یہ بھی جانتا ہوں ان کا حشر کیا ہوا''۔

''حشر کیا ہونا تھا۔ سنا ہے وہ شہنشاہ ظفر کے محل میں پہنچے اور انہیں طعنہ دیا کہ انہوں نے مجھ ایسے ہیچ مداں کو کیوں منہ لگا رکھا تھا''۔

''گستاخی معاف مرزا آپ نے غلط سنا۔ جلوس کو شہنشاہ کے محل تک پہنچنے ہی نہیں دیا گیا۔ فرشتوں کی ایک خاص گارد نے اسے حراست میں لے لیا''۔

''حراست میں لے لیا! پھر اسے کہاں لے گئے؟''

''داورِ محشر کی عدالت میں''۔

''پھر؟''

''باری تعالیٰ نے جلوس کے راہ نماؤں کو سخت ترین سرزنش کرنے کے بعد فرمایا۔ وجہ بیان کرو کہ غالب شکنی کے جرم میں ابھی کیوں نہ تمہارے پرزے اڑا دیئے جائیں''۔

''اور بھی کچھ کہا؟''

''جی ہاں۔ انہوں نے مزید فرمایا۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر جو عالم فانی میں منائی جا رہی ہے، دارالبقاء میں دیوان غالب کو سونے کے حروف میں شائع کیا جائے اور ہماری ذاتی لائبریری میں اسے وہی مقام دیا جائے جو کلیات شیکسپیئر، کلیات کالی داس اور کلیات ڈانٹے کو حاصل ہے''۔

''خالق کون ومکاں! تمہارا کس زبان سے شکریہ ادا کروں''۔ غالب سجدے میں گر جاتے ہیں اور جب اٹھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ''دیوان غالب'' کے پرزوں نے خوبصورت اوراق کی صورت اختیار کر لی ہے جن پر ان کی غزلیں سونے کے حروف میں لکھی گئی ہیں۔

☆☆☆

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ

''دھرنوں'' کا موسم تھا۔ جگہ جگہ لوگ دھرنا دے کر بیٹھے تھے۔ ایک برات نے جوشکار پور سے آئی تھی، سیٹھ لکشمی چندر کی کوٹھی کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ سیٹھ صاحب اپنی خوبصورت اور اکلوتی بیٹی کی شادی اس دولہا کے ساتھ کر دیں جو برات لے کر آیا تھا۔ سیٹھ صاحب کا کہنا تھا کہ وہ دولہا کو بالکل نہیں جانتے۔ انہیں اس کے حسب نسب کا مطلقاً علم نہیں اور نہ ہی کبھی انہوں نے اس کے ساتھ اپنی بیٹی کا بیاہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ دولہا نہایت بدصورت تھا۔ کالا بھجنگ، چیچک رو اور لم ٹنگو، لیکن برات کی رائے میں یہ سب باتیں خارج از بحث تھیں۔ اصل بات تو یہ تھی کہ برات نے دھرنا دیا تھا اور دھرنا عموماً کسی بیہودہ مطالبے کو منوانے کے لیے ہی دیا جاتا ہے۔ سیٹھ صاحب نے پولیس کو برات کے ارادے سے مطلع کیا، لیکن پولیس نے ایک خاص ذاتی معاملے میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے کمشنر سے رجوع کیا جس نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ برات کا مطالبہ منظور کر لیں ورنہ شہر میں گڑبڑ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ سیٹھ صاحب کمشنر کا ردعمل دیکھ کر بہت سٹپٹائے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس قسم کا غیر معقول مطالبہ کس طرح منظور کر سکتے ہیں۔ ادھر کمشنر صاحب انہیں سمجھا رہے تھے کہ دھرنے اور موت کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی، اس لیے وہ خوامخواہ ضد نہ کریں۔

''ضد میں کر رہا ہوں یا براتی؟'' سیٹھ صاحب نے تلملا کر پوچھا۔

''اگر آپ کا اس سے پہلے کبھی دھرنے سے پالا پڑا ہوتا تو آپ ایسا کبھی نہ کہتے۔''

''اس کا مطلب ہے مجھے اپنی مرضی کے خلاف اپنی بیٹی کی شادی اس نامعقول سے کرنا پڑے گی۔''

''اور چارہ کار بھی کیا ہے''۔

''یہ عجیب بے بسی ہے''۔

''جب سے دھرنا ایجاد ہوا ہے، بے بسی تو ایک عام سی چیز ہو گئی ہے۔ یقیناً آپ اپنے کو بے بس محسوس کرنے میں اکیلے نہیں ہیں''۔

''لیکن حکومت دھرنوں کا انسداد کرنے کے لیے کیا کر رہی ہے؟''

''وہ بھی آپ کی طرح بے بس ہے''۔

''اس کا مطلب ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس''۔

جی ہاں بشرطیکہ وہ لاٹھی دھرنا ہو''۔

یونیورسٹی کیمپس پر پانچ سو فیل شدہ طلبہ نے وائس چانسلر کی کوٹھی پر دھرنا دیا تھا۔ ان کا مطالبہ سیدھا سادا تھا یعنی انہیں پاس کر دیا جائے اور جن ممتحنوں نے انہیں فیل قرار دیا ہے، انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ وائس چانسلر فرما رہے تھے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ طلبہ انہیں یقین دلا رہے تھے کہ جب تک ان کی بات مانی نہیں جاتی وہ اپنا دھرنا جاری رکھیں گے۔ وائس چانسلر صاحب عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔ جب انہوں نے ساتویں بار طلبہ کو بتایا کہ آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا۔ تو انہوں نے کہا ''آپ اس زمانے کی بات کر رہے ہیں جب دھرنا ایجاد نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں ہر ایک چیز ممکن ہے۔

یہاں تک کہ اگر طلبہ ملک الموت کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ جائیں تو اسے بھی اس روح کو واپس کرنا پڑے گا جو اس نے قبض کی ہے۔''

آخر وائس چانسلر نے محض جان چھڑانے کے لیے کہا۔ ''مجھے کچھ مہلت دیجیے۔ میں جلد ہی سنڈیکیٹ کا اجلاس طلب کروں گا جس میں تمہارے مطالبہ پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا''۔ لیکن طلبہ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ انہوں نے اس تجویز کو غور اُردو کر کے الٹی میٹم دے دیا۔ اگر آج دوپہر

تک ان کا مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو وہ یونیورسٹی ہال کے علاوہ وائس چانسلر کی کوٹھی کو آگ لگا دیں گے۔

ایک بہت بڑے بینک کے ملازموں نے اپنے منیجر کا ''گھیراؤ'' کر رکھا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ کام کے اوقات میں پچاس فیصد تخفیف کی جائے۔ نیز ایک ہفتہ میں ایک اتوار کی بجائے دو اتوار ہونے چاہئیں۔ منیجر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''یہ دونوں باتیں میرے اختیارات سے باہر ہیں۔ آپ جنرل منیجر کے پاس ڈیپوٹیشن لے جائیں''۔ لیکن ملازمین بضد تھے کہ وہ اپنے مطالبے اسی سے منوا کر دم لیں گے۔ منیجر نے ان سے دست بستہ درخواست کی۔ ''خدا کے لیے مجھے گھر جانے کی اجازت دیجئے۔ میری بیوی سخت بیمار ہے اور گھر میں بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں''۔ ملازموں نے چنگھاڑ کر کہا۔ ''تمہاری بیوی مرے یا بچے۔ تمہارے بچوں کو کھانا ملے یا وہ بھوکے رہیں۔ ہم تو اپنے مطالبے منوانے کے بعد ہی تمہیں یہاں سے اٹھنے کی اجازت دیں گے''۔

ایک چوراہے میں ایک شخص آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے دائیں اور بائیں پٹرول اور مٹی کے تیل کے کنستر رکھے ہوئے تھے۔ اس کا مطالبہ تھا کہ جو نوبل پرائز آئرلینڈ کے ادیب سیموئیل بیکٹ کو اس سال دیا گیا، اس کا اصل میں حق دار میں ہوں۔ یہ انعام بیکٹ سے واپس لیا جائے اور مجھے دیا جائے۔ اگر ایک ہفتے کے اندر ایسا نہ کیا گیا تو میں اپنے کپڑوں پر پٹرول یا مٹی کا تیل چھڑک کر انہیں آگ لگا دوں گا اور زندہ جل مروں گا۔

اس سے جب پوچھا گیا ''تم اپنے کو کس اعتبار سے سیموئیل بیکٹ سے بہتر ادیب سمجھتے ہو'' تو اس نے جواب دیا ''جس ڈرامے پر بیکٹ کو انعام دیا گیا، اس کی ضخامت اسی صفحے پر ہے اور اس میں صرف چار کردار ہیں۔ جو ڈرامہ میں نے لکھا ہے اس کی ضخامت دو سو چالیس صفحے ہے اور اس میں چوبیس کردار ہیں''۔

اس شخص کے قریب ہی پیپل کے درخت کے نیچے ایک شخص نے بھوک ہڑتال کر رکھی تھی۔ اس کا مطالبہ تھا جب تک دہلی کی بجائے بنگلور کو ہندوستان کا دارالخلافہ نہیں بنایا جاتا وہ بھوک ہڑتال جاری رکھے گا۔

کسی نے اس سے سوال کیا ''دہلی میں کیا قباحت ہے؟'' اس نے جواب دیا ''دہلی مجھے بالکل پسند نہیں۔ دہلی رہنے کے لیے مکان ملتا ہے نہ سواری کے لیے۔ کبھی ہندوستان کا

دارالخلافہ کلکتہ تھا جو کہ مشرقی ہندوستان میں واقع ہے۔ پھر یہ شمالی ہندوستان میں منتقل ہو گیا۔ اب جنوبی ہندوستان کو موقع ملنا چاہیے''۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے نزدیک تین سو افراد ریلوے لائن پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا جب تک ریلوے کے اعلیٰ حکام یہ صادر نہیں کرتے کہ آئندہ ہر ''میل'' اور ''ایکسپریس'' گاڑی ان کے اسٹیشن پر ٹھہرا کرے گی، وہ کسی گاڑی کو آگے نہیں جانے دیں گے۔ ان سے سوال کیا گیا۔ ''اگر میل یا ایکسپریس ہر چھوٹے اسٹیشن پر ٹھہرے گی تو پھر وہ میل یا ایکسپریس کیسے رہے گی''۔ انہوں نے بڑی بے رخی کے ساتھ جواب دیا۔ ''ہم کب کہتے ہیں کہ وہ ہر چھوٹے اسٹیشن پر ٹھہرے، ہم تو اسے صرف اپنے اسٹیشن پر ٹھہرنے کے لیے کہہ رہے ہیں''۔

ایک محلے میں بیویوں نے شوہروں کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ آئندہ شام کا کھانا شوہروں کو تیار کرنا پڑے گا، بیویاں کلب یا سینما جایا کریں گی اور رات گئے گھر لوٹیں گی۔

کچھ بیویوں نے جو ضرورت سے زیادہ ''ٹارزن'' واقع ہوئیں تھیں، یہ تجویز پیش کی کہ بچے کی پیدائش کی ذمہ داری بھی شوہروں کو سونپ دی جائے، لیکن اکثریت کا یہ خیال تھا کہ یہ مطالبہ ناجائز ہے، اس کے لیے تو قدرت کے خلاف مورچہ لگانا پڑے گا۔

ایک مشہور اخبار کے خاص نمائندہ نے یہ تمام دھرنے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس نے سوچا ''سبحان اللہ! یہ دھرنا بھی کیا دلچسپ ایجاد ہے، جس کی بدولت ہر مراد بر آتی ہے۔ روٹھوں کو منانا ہو تو دھرنا، سنگدل محبوب کو راہ پر لانا ہو تو دھرنا، ہتھیلی پر سرسوں جمانا ہو تو دھرنا۔ دھرنا کیا ہے اچھا خاصہ الہ دین کا چراغ ہے۔ معاً اسے خیال آیا کیوں نہ وہ بھی اخبار کے مالک کو الٹی میٹم دے دے کہ اگر اسے دو ایک دن میں چیف ایڈیٹر نہ بنایا گیا تو وہ اخبار کے دفتر کی سہ منزلہ عمارت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرے گا۔

☆☆☆

بیس سو ستر

ہندوستان کی تاریخ میں 2070ء بڑا عجیب اور اہم سال تھا۔ اس سال پوری ایک صدی کے بعد خاندانی منصوبہ بندی رنگ لائی۔ ملک کی آبادی پچپن کروڑ سے گھٹ کر پچپن لاکھ رہ

گئی، لیکن ادھر آبادی کم ہوئی، ادھر سیاسی جماعتوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ اب ان کی تعداد پانچ سو پچپن تھی حالانکہ 1970ء میں صرف پچپن پارٹیاں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشہور سیاسی جماعتوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے متعدد پارٹیوں کو جنم دیا ہے۔ مثال کے طور پر ''تلوار پارٹی'' کو ہی لیجئے۔ اس کی چودہ اولادیں ہوئیں۔ جن میں سے تیز تلوار پارٹی، کند تلوار پارٹی، زنگ خوردہ تلوار پارٹی، قابل ذکر ہیں۔ ''پاگل پارٹی'' کے بچوں کی تعداد اکیس تھی۔ جس میں سے چند کے نام تھے، نیم پاگل پارٹی، تین ٹبا چار پاگل پارٹی، پانچ ٹبا چھ پاگل پارٹی، ننانوے فیصد پاگل پارٹی، جہاں تک ''لچر پارٹی'' کا تعلق ہے، اسے بتیس پارٹیوں کا خالق ہونے کا فخر حاصل تھا۔ جن میں لچر لچر پارٹی، لچر تر پارٹی، لچر ترین پارٹی، نے دیار ہند میں اپنا مقام پیدا کیا۔ ایک مختصر سے مضمون میں ان تمام پارٹیوں کا تعرف نا ممکن ہے، اس لیے صرف چند پارٹیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پستول پارٹی:۔ (الیکشن نشان کارتوس) یہ 1980ء کی مشہور پارٹی کی (جس کا نام ریوالور تھا) پڑپوتی تھی۔ اس کا نعرہ تھا..... اٹھ ساقی اٹھ پستول چلا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جس شخص کو دلائل سے قائل نہیں کیا جا سکتا، اسے پستول سے کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ موت کے بعد کوئی شخص بحث نہیں کر سکتا۔ یہ پارٹی سمجھتی تھی کہ ہندوستان کے تمام مسائل کا علاج پستول ہے۔ اگر ہر شخص کے ہاتھ میں پستول تھما دیا جائے تو وہ اپنی روزی کا بندوبست خود کر لے گا اور اس طرح خوراک اور بے روزگاری کے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

بندوق پارٹی:۔ (الیکشن نشان تھری ناٹ تھری) اس پارٹی کے اراکین پہلے پستول پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں انہوں نے پارٹی کے خلاف بغاوت کر کے ایک نئی پارٹی قائم کی۔ اس پارٹی کی رائے میں ہندوستان کو پستول کی نہیں بندوق کی ضرورت تھی۔ اس پارٹی کا دعویٰ تھا کہ جتنے اشخاص پستول پارٹی نے ایک سال میں ہلاک کیے۔ ان سے زیادہ اس نے ایک ہفتہ میں کیے۔ اس پارٹی کا نعرہ تھا ''بندوق پر مودھرما''۔

دھماکا پارٹی: (الیکشن نشان، بارود) اس پارٹی کے اراکین کا صرف ایک شغل تھا۔ یعنی ہر روز کہیں نہ کہیں دھماکا ہونا چاہیے۔ کسی بلڈنگ، کسی چھت، کسی دیوار کو ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اڑانا چاہیے۔ اس پارٹی سے ریلوے اسٹیشن، ڈاکخانے، تار گھر خاص طور پر پناہ مانگتے تھے

کیونکہ اسے اس قسم کی عمارتوں سے ''الرجی'' تھی۔ اس پارٹی کا نعرہ تھا۔ ''ہم اپنی تخریب کر رہے ہیں ہماری وحشت کا کیا ٹھکانا''۔

پراچین سنسکرتی پارٹی:۔ (الیکشن نشان ''جنگل'') اور پارٹی کا نعرہ تھا دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو!۔۔ یہ پارٹی پتھر اور دھات کے زمانے کو از سر نو زندہ کرنا چاہتی تھی۔ اسے ہوائی جہاز، ٹیلیویژن اور لپ اسٹک سے سخت نفرت تھی۔ یہ جھگڑے، رتھ اور پان کی دلدادہ تھی۔ اس کے خیال میں وقت کو ماضی، حال اور مستقبل کے خانوں میں بانٹنا سراسر غلط تھا۔ صحیح تقسیم یہ تھی۔ ماضی، ماضی، ماضی۔

خونخوار پارٹی:۔ (الیکشن نشان ''بھیڑیا'') یہ پارٹی طاؤس ورباب کی بجائے شمشیر وسناں کی سرپرستی کرتی تھی۔ اس کا عقیدہ تھا، عوام بھیڑیں ہیں۔ پہلے ان سے ووٹ حاصل کرو، پھر ان پر بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑو۔ اگر وہ شکایت کریں تو انہیں طعنہ دو کہ بھیڑیوں کو ووٹ دو گے تو تمہارا یہی حشر ہوگا۔

مکار پارٹی:۔ (الیکشن نشان ''لومڑی'') اس پارٹی کا دعویٰ تھا کہ کامیاب سیاست دان وہ ہوتا ہے جو لومڑی اور لگڈ بگڑ کا مرکب ہو..... جو غریبوں کے ساتھ ہمدردی جتائے، لیکن ساتھ ہی ان کا خون چوسے۔ جو عوام کی خدمت کرنے کا حلف اٹھائے، لیکن در اصل اپنے کنبے کی خدمت کرے جو پلیٹ فارم پر جنتا کی محبت کا دم بھرے، لیکن در پردہ انہیں لوٹنے کے منصوبے بنائے، جو عوام کو دس بار دھوکا دینے کے بعد گیارہویں بار دھوکا دینے کے لیے تیار رہے اور جو دن رات اقبال کا یہ مصرع گنگنائے۔ ع

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار

غدار پارٹی:۔ (الیکشن نشان ''مار آستین'') ملک اور قوم سے غداری کرنا اس پارٹی کا شیوہ تھا۔ یہ پارٹی جس تھالی میں کھاتی تھی اس میں چھید کرتی تھی۔ اس پارٹی کے اراکین کا شجرہ نسب جعفر اور صادق سے ملتا تھا جن کے متعلق اقبال نے کہا تھا

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ ملت، ننگ دیں، ننگ وطن

ضمیر فروش پارٹی:۔ (الیکشن نشان ''بلیس'') یہ پارٹی اپنے ضمیر کو نیلام کرنے کے لیے ہر

وقت تیار رہتی تھی۔ اس کی دانست میں جو شخص اپنے ضمیر کو فروخت نہیں کرتا تھا وہ ہمیشہ تنگ دست اور بدحال رہتا تھا۔ اس پارٹی کے اراکین کھلے بندوں خریداروں کو بولی دینے کے لیے کہتے اور سب سے بڑی بولی پر اپنا ضمیر فروخت کر کے خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ جب ان سے پوچھا جاتا، خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے تو کہتے تھے منہ پر نقاب ڈال لیں گے۔

بے غیرت پارٹی: ۔(الیکشن نشان ''چکنا گھڑا'') یہ پارٹی ہر بار الیکشن میں ناکام رہتی تھی، لیکن الیکشن لڑنے سے باز نہیں آتی تھی۔ اس پارٹی کے ہر رکن کی ضمانت ضبط ہو جاتی تھی، لیکن اس کے باوجود اسے یقین رہتا تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہوں گا اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالوں گا۔

نہایت بے غیرت پارٹی: ۔(الیکشن نشان ''گنجی چاند'') اس پارٹی کا جنرل سیکرٹری اور خزانچی تھا اور جس کو الیکشن میں صرف ایک ووٹ ملتا تھا۔ یعنی اپنا ہی ووٹ۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے اس پارٹی کے دو اراکین تھے۔ بعد میں ان میں جھگڑا ہو گیا اور دوسرے رکن نے اپنی علیحدہ پارٹی بنالی جس کا نام غایت درجہ بے غیرت پارٹی۔

گرگٹ پارٹی: ۔(الیکشن نشان ''گرگٹ'') اس پارٹی کا نعرہ تھا ..... بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے! اس پارٹی کے اراکین صبح کو مکار، دوپہر کو خونخوار، شام کو غدار اور رات کو بدکار کہلاتے تھے۔ انہیں اس بات پر ناز تھا کہ جس سرعت کے ساتھ ہم پارٹی بدلتے ہیں، لوگ قمیص بھی نہیں بدلتے۔ معمولی سے معمولی لالچ کی خاطر یہ اپنے، احباب کو آنکھیں دکھا کر اغیار کی جماعت میں شامل ہو جاتے تھے۔ عموماً اپنی صفائی میں علامہ اقبال کا مصرع پیش کیا کرتے تھے۔ ع

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

خودغرض پارٹی: ۔(الیکشن نشان ''جنگلی سور'') اس پارٹی کے اراکین ملک اور قوم کے مفاد کو ذاتی مفاد پر قربان کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ الیکشن جیتنے کے بعد ان میں سے ہر شخص وزیراعلیٰ بننے کی کوشش کرتا اور جب اپنی کوشش میں ناکام رہتا تو وزارت کا تختہ پلٹنے کی کوشش کرتا اور عموماً کامیاب ہو جاتا۔ اس کے بعد داغ دہلوی کا یہ مصرع زبان پر لاتا۔ ع

ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

(نوٹ) بظاہر یہ پارٹیاں مختلف تھیں۔ ان کے الیکشن نشان مختلف تھے، ان کے نعرے

مختلف تھے، اصول مختلف تھے، لیکن ان کی مشترکہ امیدیں 2075ء میں برآئیں اور ہندوستان کا نام لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹا دیا گیا اور اس کے ساتھ ان پارٹیوں کا مادی اور سیاسی وجود بھی ختم ہو گیا!!

☆☆☆

ڈاکٹر بالغ

اگر صرف ایک فقرے میں ڈاکٹر بالغ کا تعارف کرانا مقصود ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے سب سے بڑے غالب شناس ہیں اور سچ تو یہ ہے انہیں یہ سعادت یونہی نصیب نہیں ہوئی گذشتہ پچیس برس سے وہ غالب، خاص کر دیوانِ غالب پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس وقت تک پانچ سو صفحات لکھ چکے ہیں، جو بقول ان کے محض تمہید کے طور پر تحریر کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر بالغ اگر چاہتے تو اس طویل تمہید میں ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ کر قارئین کا وقت ضائع کر سکتے تھے، لیکن خدا کا شکر ہے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے ان پانچ سو صفحات میں ساڑھے چار سو اپنی ذات کے لیے وقف کیے ہیں، لیکن باقی پچاس میں غالب سے متعلق واقعی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ''شروع شروع میں تو میں سمجھتا رہا کہ دیوانِ غالب کا مصنف مرزا ہرگوپال تفتہ ہے کیونکہ غالب کو شطرنج کھیلنے اور ''اک گونہ بے خودی'' سے جوان پر دن رات طاری رہتی تھی، فرصت ہی کب ملتی تھی کہ وہ شعر کہہ سکیں۔ انہوں نے اپنے شاگرد رشید مرزا تفتہ سے فرمائش کی ہوگی کہ ان کے لیے ایک دیوان تیار کریں جس کا نام دیوانِ غالب ہو، لیکن دو سال اس تھیوری پر کام کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ یہ کچھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ تب میں نے قیاس لگایا کہ دیوانِ غالب، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی تصنیف ہے۔ تین سال اس تھیوری پر تحقیق کرتا رہا۔ جب یہ بھی غلط ثابت ہوئی تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دیوانِ غالب کو دو شعرا نے مل کر لکھا اور وہ تھے اسد اور غالب۔ اس لیے دیوانِ غالب کی بجائے اسے دیوانِ اسد و غالب کہنا چاہیے۔ تحقیق کے دوران دو ایک بار مجھے شک ہوا کہ دیوانِ غالب میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ کیونکہ لفظ ''بالغ'' میں غالب کے تمام حروف شامل ہیں اور غالب کے مقطعوں میں بالغ پڑھا جائے تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ مثلاً

عشق نے بالغ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر یک لخت مجھے یاد آیا کہ میں سرے سے شعر ہی نہیں کہہ سکتا، اس لیے دیوان غالب کا مصنف کس طرح ہو سکتا ہوں۔

ڈاکٹر بالغ کی رائے میں یہ امر بعید از قیاس ہے کہ غالب کے دو تخلص تھے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں "کوئی درباری شاعر دو تخلص کس طرح کر سکتا تھا۔ کیا باقی شعرا یہ اعتراض نہ کرتے کہ جہاں مقطع میں غالب بطور تخلص نہیں لایا جا سکتا، وہاں اسد لایا جا رہا ہے جو کہ اصول غزل گوئی کے سراسر خلاف ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ اسد اور غالب جگری دوست تھے۔ انہوں نے مل کر دیوان چھپوانے کا قصد کیا، کیونکہ دونوں کا شعری سرمایہ بے حد قلیل تھا۔ اگر علیحدہ علیحدہ دیوان چھپواتے تو اول تو وہ اپنی مضحکہ خیز ضخامت کی وجہ سے مقبول نہ ہوتا، دوسرے مصارف بھی زیادہ کرنے پڑتے"۔

آگے چل کر ڈاکٹر بالغ فرماتے ہیں۔ "بہر حال اگر اتمام حجت کی خاطر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اسد اور غالب ایک ہی شاعر کے دو تخلص ہیں تو یہ عین مناسب ہوگا کہ اب تمام مقطعوں میں اسد یا غالب کی بجائے مرزا کر دیا جائے تا کہ آنے والی نسلیں اسے دو کی بجائے ایک شاعر کا کلام سمجھیں۔ غالب اور مرزا ہم وزن الفاظ ہیں، اس لیے جن مقطعوں میں غالب تخلص آیا ہے وہاں مرزا لکھ دینے سے بخوبی کام چل سکتا ہے۔ مثلاً

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان مرزا
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

البتہ اسد کی بجائے مرزا لکھتے وقت مصرعوں میں معمولی تصرف کرنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر۔ ع

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد

کے بجائے یہ لکھنا ہوگا۔ ع

ہستی کے مت فریب میں اے مرزا آئیو

اسی طرح۔ ع

چاہتے ہیں خوبروؤں کو اسد

کی نئی صورت یہ ہوگی۔ ع

خوبروؤں کو ہیں مرزا چاہتے

ڈاکٹر بالغ کی تحقیق کے مطابق کاتب کی غلطی سے دیوان میں متعدد اشعار غالب کے معاصرین کے شامل ہو گئے ہیں۔ ان کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔ ''کیا کوئی شخص بقائمی ہوش وحواس یہ باور کر سکتا ہے کہ مندرجہ ذیل اشعار غالب کے ہیں

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

ان اشعار کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ یہ مولانا حالی کے ہیں پر چونکہ مرزا صاحب کو حالی بہت عزیز تھے، اس لیے انہوں نے از راہ محبت یہ اشعار اپنے دیوان میں شامل کر لیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اشعار مولانا حالی کے اصرار پر شامل کیے گئے ہوں تا کہ سارے دیوان میں دو شعر تو ایسے ہوں جنہیں ایک عام قاری سمجھ سکے۔

غالب کی غزل جس کا مطلع ہے۔ ع

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن

اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ یہ دراصل داغ دہلوی کی غزل ہے۔ خاص کر اس غزل کا مقطع تو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں داغ کا ہوں غالب کا نہیں

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

داغ کا ایک اور شعر جو خواہ مخواہ دیوان غالب میں در آیا ہے یہ ہے۔

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اور اس شعر کا خالق تو میر کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

دیوان غالب میں کتابت کی غلطیوں کا ذکر کرتے وقت ڈاکٹر بالغ نے چند حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں۔ ان کی رائے میں غالب کے کئی اشعار محض کاتب کی غفلت شعاری سے نشہ

کی بجائے شعر بن کے رہ گئے ہیں۔ بالغ صاحب نے مشتے از خروارے کے مصداق پانچ اشعار منتخب کئے ہیں جو اگر صحیح صورت میں لکھے جاتے تو بیت الغزل کہلاتے

(شعرغالب) کوئی صورت نظر نہیں آتی
یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے
(کاتب) کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

(شعرغالب) دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
(کاتب) دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

(شعرغالب) اسد بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے
عدو کے ہو لئے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو
(کاتب) اسد بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے
تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

(شعرغالب) لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یاں آ پڑی یہ شرم کی تکرار کیا کریں
(کاتب) لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

(شعرغالب) اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
(کاتب) اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ڈاکٹر بالغ کی ریسرچ میں ایک مقام ایسا بھی آیا ہے جہاں تحقیق، تحقیق نہیں رہی، الہام بن گئی ہے۔ سالہا سال کی دماغ سوزی کے بعد انہوں نے اس ستم پیشہ ڈومنی کا نام ڈھونڈ نکالا ہے جس پر

غالب مرتے تھے اور جسے انہوں نے عمر بھر کے لیے مار رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی دانست میں اس کا نام ناز تھا۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انہوں نے غالب کے چند اشعار پیش کیے ہیں۔

میں نے کہا کہ بزم ''ناز'' چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

(نوٹ) غالب نے نثر میں اپنی محبوبہ کو ستم پیشہ کا لقب دیا تھا۔ اس شعر میں اسے ستم ظریف'' کہہ کر یاد کیا ہے۔

چند اور مثالیں ملاحظہ فرمایئے

ہماری سادگی تھی التفات ''ناز'' پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظلم مگر تمہید جانے کی
اک نو بہار ''ناز'' کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے
دشنہ غمزہ جانستاں ناوک ''ناز'' بے پناہ
وہ نشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے
نگاہ ''ناز'' کو پھر کیوں نہ اشنا کہیئے

ڈاکٹر بالغ کے خیال میں جس محبوبہ کی وفات پر مرزا نے اپنا مشہور مرثیہ لکھا تھا۔ وہ ''ناز'' ہی تھی۔ جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے

گلفشانی ہائے ''ناز'' جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

آپ نے ڈاکٹر بالغ کے تمہیدی مقالہ سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائے۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فن تحقیق میں ان کا کیا مقام ہے۔ اب بھی اگر مرزا غالب یہ شکایت کریں کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا، تو چاہے آپ غالب کے طرف دار ہی کیوں نہ ہوں، آپ محسوس کریں گے کہ مرزا صاحب، ڈاکٹر بالغ کے ساتھ بے انصافی کر رہے ہیں اور ان کا شکوہ نہ صرف بے جا ہے بلکہ بے بنیاد بھی ہے!!

☆☆☆

قہوہ خانے میں

کردار

کجلا دیوی..... ایک جدید شاعرہ
پنگل..... ایک جدید شاعر
گوپال..... ایک بیوپاری
سریش..... ایک طنز نگار

پنگل:۔ بیرا!!

بیرا:۔ حضور!

پنگل:۔ چار ہاٹ کافی۔

کجلا:۔ (بیرے سے) تین ہاٹ۔ ایک کولڈ

پنگل:۔ (بیرے سے) دو ہاٹ۔ دو کولڈ

سریش:۔ پنگل صاحب، آپ بھی کولڈ پئیں گے۔

پنگل:۔ جی ہاں، کیونکہ کجلا دیوی کولڈ پئیں گی۔

سریش:۔ آپ ہر بات میں کجلا دیوی کی پیروی کیوں کرتے ہیں؟

پنگل:۔ سریش صاحب۔ کجلا دیوی دانشوروں کی امام ہیں۔ آپ نے شاید انکا تازہ مرثیہ نہیں پڑھا۔

گوپال:۔ مرثیہ! تو گویا آج کل یہ مرثیے لکھ رہی ہیں کوئی تازہ چوٹ لگی ہے شاید!

کجلا:۔ نہیں یہ بات نہیں۔ میں نے ایک خرگوش پر مرثیہ لکھا ہے۔

گوپال:۔ خرگوش پر؟ موضوع تو برا نہیں۔

سریش:۔ (کجلا دیوی سے) آپ نے خرگوش کے لمبے لمبے کانوں کی خوب تعریف کی ہوگی۔

گوپال:۔ گدھے کے علاوہ خرگوش کے کان بہت لمبے ہوتے ہیں۔

سریش:۔ (پنگل کے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) آپ پنگل صاحب کو کیوں بھول رہے ہیں۔

پنگل:۔(سریش کی بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے) میں نے کجلا دیوی کا مرثیہ پڑھا مجھے بے اختیار خرگوش پر رشک آیا۔

گوپال:۔حالانکہ ترس آنا چاہیے تھا۔

سریش:۔یعنی آپ کا جی چاہنے لگا، کاش میں انسان کی بجائے خرگوش ہوتا۔

پنگل:۔جی ہاں، کجلا دیوی کی طرح میں تمام جانوروں سے محبت کرتا ہوں۔

سریش:۔اور تم انسانوں سے نفرت۔

کجلا:۔انسان تو روز ازل سے قابل نفرت رہا ہے۔

گوپال:۔آپ اور پنگل صاحب اپنے اپنے دماغ کا نفسیاتی تجزیہ کرائیے۔آخر آپ ہمیشہ چوہوں، بلیوں اور مرغیوں پر نظمیں کیوں لکھتے ہیں؟

کجلا:۔یہ بات نہیں، میں نے کیڑوں مکوڑوں پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔

سریش:۔یک شد نہ دو شد!

پنگل:۔سریش صاحب۔آپ کو کجلا دیوی کی ''تیتر'' پر لکھی نظم پڑھنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔

سریش:۔جی ابھی تک تو نہیں ہوا۔ویسے میں تیتر پر نظم پڑھنے کی بجائے اس کا شکار کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

کجلا:۔آپ ایک دم جانور ہیں۔

سریش:۔پھر تو آپ مجھ سے محبت کر سکتی ہیں۔

(بیرا کافی لاتا ہے)

کجلا:۔کافی دیکھ کر مجھے حبشیوں کی وہ ملکہ یاد آجاتی ہے جو ہر رات سونے سے پہلے گایا کرتی تھی۔

''اے چمگادڑ تو کتنی اداس ہے''۔

پنگل:۔اور مجھے خوابوں کے وہ جزیرے یاد آتے ہیں جن پر انسانوں کی بجائے لنگور رہتے ہیں۔

سریش:۔اور مجھے خیال آتا ہے تم دونوں پاگل ہو گئے ہو یا بہت جلد ہو جاؤ گے۔

کجلا:۔آپ سو فیصد گھامڑ ہیں۔

پنگل:۔کافی کا مزا اس کے کڑوے پن میں ہے۔

کجلا:۔ (سرد آہ بھر کر) زندگی کتنی کڑوی ہے، کریلے کی طرح!

پنگل:۔ سبحان اللہ! کتنی نادر تشبیہ ہے!

کجلا:۔ کریلے سے میرا دھیان "اکیلے" کی طرف چلا گیا۔ آہ! ہم سب کتنے اکیلے ہیں۔ اکیلے اور اداس، جیسے کسی بیابان میں کیکر کے درخت پر بیٹھا الو خون کے آنسو بہا رہا ہو۔

پنگل:۔ بہت خوب۔ آپ کے تخیل کا جواب نہیں۔

سریش:۔ کجلا جی۔ آپ شاید نہیں جانتیں الو کو بیابان کتنا اچھا لگتا ہے۔ بھلا وہ خون کے آنسو کیوں بہائے گا۔

کجلا:۔ کیا آپ کا مطلب ہے الو کبھی جذباتی نہیں ہو سکتا۔ میں نے ایک الو کو دہاڑیں مار کر روتے دیکھا ہے۔

گوپال:۔ الو کو نہیں پنگل جی کو دیکھا ہوگا۔

کجلا:۔ (چمک کر) واہ! کیا میں پنگل جی اور الو میں تمیز نہیں کر سکتی۔

سریش:۔ آپ کیا، کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

پنگل:۔ اجی چھوڑیئے۔ کجلا جی ڈیزی کا کیا حال ہے؟

گوپال:۔ یہ ڈیزی دیوی کون ہیں؟

کجلا:۔ ڈیزی میری ایرانی بلی کا نام ہے۔

گوپال:۔ ہم سمجھے آپ کی کوئی بڑی پیاری سہیلی ہے۔

کجلا:۔ اس میں کیا شک ہے۔ ڈیزی میری عزیز ترین سہیلی ہے۔

پنگل:۔ سریش صاحب۔ اگر آپ بلی پالتے تو اس کا کیا نام رکھتے؟

سریش:۔ میرا دماغ چل گیا ہے کیا۔ میں بلی پالتا ہی کیوں جو اس کا نام رکھنے کی ضرورت پڑتی۔

کجلا:۔ آپ بالکل خشک آدمی ہیں۔ آپ کو تو خشک پھلوں کا بیوپاری ہونا چاہیے تھا۔

پنگل:۔ خشک پھلوں میں خوبانی کی کیا بات ہے۔ اس نام میں کتنی شاعری ہے۔

سریش:۔ لو اور سنو! خوبانی کی گٹھلی تو سنی تھی۔ آج پتا چلا اس میں شاعری بھی ہوتی ہے۔

گوپال:۔ اچھا ہمیں تو اجازت دیجیے۔ شری متی جی انتظار کر رہی ہوں گی۔

پنگل: ۔ ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں۔

گوپال: معاف کیجئے۔ میں اپنی بیوی سے ذرا ڈرتا ہوں۔

کجلا: ۔ میں ان شوہروں سے نفرت کرتی ہوں جو زن مرید ہوتے ہیں۔

گوپال: ۔ اس کا مطلب تو ہوا آپ سب شوہروں سے نفرت کرتی ہیں۔ اچھا آداب عرض!

پنگل: ۔ کجلا جی اس ناٹک کا کیا بنا جو آپ ''جنتر منتر ٹھیئر'' کے لیے لکھ رہی تھیں۔

کجلا: ۔ وہ تو کبھی کا لکھا جا چکا۔

سریش: ۔ کیا اس میں بھی آپ کے پہلے ناٹک کی طرح یاسیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

کجلا: ۔ یاسیت ایک ٹھوس حقیقت ہے سریش صاحب۔ آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ مسرت تو ایک سانحہ ہے۔ ایک کبھی ہاتھ نہ آنے والا لمحہ۔ آپ نے فراق کا وہ شعر سنا ہوگا

زندگی کیا ہے آج سے اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

سریش: ۔ لیکن سوال یہ ہے آپ ہر وقت اداس کیوں رہتے ہیں؟

پنگل: ۔ یہ سب اس دور کا قصور ہے جس میں ہم پیدا ہوئے ہیں۔ اس دور میں جو شخص مسکراتا ہے وہ نیم پاگل ہے اور جو قہقہہ لگاتا ہے وہ سو فیصدی پاگل۔

سریش: ۔ آپ کے خیال میں سب سے بڑا دانشور وہ ہے جو مالیخولیا کے مرض میں مبتلا ہے۔

کجلا: ۔ مالیخولیا! کتنا خوبصورت لفظ ہے۔ آنسو کی طرح۔ میں کبھی سوچتی ہوں یہ دنیا کتنی حسین ہوتی اگر ہم سب دن رات آنسو بہایا کرتے۔

سریش: ۔ حسین تو خاک ہوتی البتہ ماتم کدہ بن جاتی۔

کجلا: ۔ کیا آپ کے نزدیک اب یہ ماتم کدہ نہیں ہے۔ یقیناً آپ شدید قسم کی خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ اگر آپ کے پاس سوچنے والا دماغ ہوتا تو آپ ہرگز یہ نہ کہتے۔

سریش: ۔ سوچنے والا دماغ تو صرف آپ جیسے دانشوروں کے ہی پاس ہے۔

کجلا: ۔ دراصل آپ کا بھی قصور نہیں۔ آپ کو اس مقدار میں افیون کھلائی جا رہی ہے کہ آپ کا دماغ بے کار ہو گیا ہے۔

سریش:۔ افیون؟ کون سی افیون؟

پنگل:۔ سریش صاحب۔ مذہب، اخلاق، سائنس، تعلیم یہ سب افیون ہی تو ہیں۔

کجلا:۔ ہمارا فلسفہ نہایت خوشگوار اور جاندار فلسفہ ہے۔

کجلا:۔ اس میں کیا قباحت ہے۔ جب زندگی ہی بے معنی ہو تو زندہ رہنے کا فائدہ؟

سریش:۔ اگر آپ دونوں خودکشی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

پنگل:۔ لیکن ہم ابھی خودکشی نہیں کریں گے۔ ہمیں ایسے فلسفے کی تبلیغ کرنا ہے۔

سریش:۔ آپ انفرادی خودکشی میں نہیں اجتماعی خودکشی میں یقین رکھتے ہیں۔

کجلا:۔ چھوڑیئے۔ اپ کیا قصہ لے بیٹھے۔ بات تو میرے ناٹک کی ہو رہی تھی۔

پنگل:۔ کجلا جی۔ یہ ناٹک کب کھیلا جا رہا ہے۔

کجلا: مجھے افسوس ہے یہ ناٹک کبھی نہیں کھیلا جائے گا۔

پنگل:۔ (چونک کر) خیر تو ہے؟

کجلا:۔ اس کے لیے نہ مناسب ہیرو مل رہا ہے نہ ہیروئن۔

سریش: ایسی کیا بات ہے کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔

کجلا:۔ بات دراصل یہ ہے میرے ناٹک کی ہیروئن ایک خوبصورت لومڑی ہے۔

سریش:۔ اکثر ہمارے ناٹکوں کی ہیروئن ایسی ہی ہوتی ہے۔

کجلا:۔ لیکن وہ ایک بندر سے محبت کرتی ہے۔

سریش:۔ تو کیا حرج ہے۔ ہمارے ناٹکوں میں ہیروئن جس سے محبت کرتی ہے۔ اس میں اور ایک بندر میں فرق ہی کتنا ہوگا۔

کجلا:۔ آپ تو محض بکواس کر رہے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کوئی ہیروئن ہی ڈھونڈ دیں۔

سریش:۔ اچھا سوچ کر بتاتا ہوں۔

کجلا:۔ آپ سوچئے۔ میں ذرا میک اپ ٹھیک کرلوں (میک اپ ٹھیک کرتی ہیں)

سریش:۔ (کجلا کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے) بخدا۔ میک اپ کے بعد آپ ہو بہو اپنے ناٹک کی ہیروئین نظر آتی ہیں۔

کجلا:۔ آپ کی عقل گھاس چرنے تو نہیں گئی؟

سریش:۔ یقین نہ آئے تو پنگل جی سے پوچھ لیجئے۔

کجلا:۔ کیوں پنگل جی، کیا یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں؟

پنگل:۔ ٹھیک نہیں تو اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہے۔

کجلا:۔ چلئے ایک مشکل تو حل ہوئی۔

سریش:۔ اور دوسری مشکل کا حل یہ ہے کہ پنگل جی میک اپ کے بغیر ہیرو کے پارٹ کے لیے موزوں ترین شخص ثابت ہوں گے۔

کجلا:۔ پنگل جی، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔ کیا آپ ہیرو کا پارٹ کرنے پر رضا مند ہیں؟

پنگل:۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔

سریش:۔ اس کا مطلب یہ ہوا۔ اب یہ سرکس ضرور ہوگا۔

کجلا:۔ سرکس نہیں نائک۔

سریش:۔ آپ اسے نائک کہہ لیجئے، لیکن غیر دانشوراس کھیل کو جس میں جانور کام کریں۔ سرکس ہی کہیں گے۔

کجلا:۔ غیر دانشوروں پر خدا کی لعنت!۔

سریش:۔ آمین۔ ثم آمین!!!

☆☆☆

شیخ سلی

شیخ سلی کہ جو شیخ چلی کے پڑپوتے کہلاتے تھے۔ دور کی کوڑی لانے میں یکتائے روزگار تھے۔ ایک دن بیگم سے کہنے لگے۔ ''پلان بناؤ ورنہ تباہ ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ''۔ بیگم سمجھیں شیخ صاحب فیملی پلاننگ کا ذکر کر رہے ہیں۔ ہوائیں ہاتھ نچاتے ہوئے بولیں ''شرم نہیں آتی۔ اس عمر میں فیملی پلاننگ کا ذکر کرتے ہوئے۔ گیارہ بچے پیدا کرنے کے بعد جب طبیعت اوب گئی تو توبہ کی سوجھی''۔

شیخ صاحب نے بیگم کی ناسمجھی پر سر پیٹنے کے بعد جواب دیا۔ ''ہمیں آج تک پتا نہ چلا کہ

خدا نے کس مصلحت کی بنا پر تمہیں عقل سے محروم رکھا۔ ہم پلاننگ کا نہیں سات سالہ پلان کا ذکر کر رہے ہیں۔ اولاد کے متعلق ہمارا جو نظریہ ہے، اس سے ساری دنیا بخوبی واقف ہے۔ دراصل غالب کا جو عقیدہ آموں کے بارے میں تھا، ہمارا وہی بچوں کے بارے میں ہے۔ یعنی زیادہ ہوں اور میٹھے ہوں۔ میٹھے یعنی ''سویٹ'' ہم بچوں کی تعداد سے کبھی نہیں گھبرائے۔ اگر ایک بچہ بھی لائق ثابت ہو، ننانوے نالائق بچوں کی تلافی ہو جاتی ہے''۔

''پھر یہ سات سالہ بلان کیا ہے؟''۔

''توبہ! توبہ! بدمذاقی کی حد ہو گئی۔ تم پلان کو بلا سمجھتی ہو۔ یہی وجہ ہے ہمارے یہاں زبوں حالی نے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ تم نے شاید وہ شعر نہیں سنا:

''یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم
. . . . . .

بیگم نے شیخ صاحب کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔ ''کون سے یاران تیز گام نے؟'' شیخ صاحب نے جھلا کر کہا۔ ''لاحول ولا۔ عجیب نامعقول عورت ہو، کتنے بیہودہ سوال کرتی ہو۔ ارے بھئی! انہوں نے جنہیں خداوند کریم نے توفیق دی کہ سات سالہ پلان بنائیں۔

''اس سے انہیں کیا فائدہ ہوا؟''

''ان کے وارے نیارے ہو گئے۔ ان دنوں وہ کروڑ پتی کہلاتے ہیں، شاندار کوٹھیوں میں رہتے ہیں، پرتکلف کاروں میں گھومتے ہیں، مطلب یہ کہ بڑے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہے ہیں حالانکہ وہ کبھی ہم سے بھی زیادہ مفلس اور قلاش تھے''۔

''اگر یہ بات ہے تو آپ بھی اللہ کا نام لے کر سات سالہ پلان بنا ڈالئے۔ شاید اس سے ہی ہمارے دن پھریں''۔

''ابھی بناتے ہیں۔ تم ہمت کر کے ایک کاغذ اور قلم لے آؤ''۔

کاغذ کو میز پر رکھتے ہوئے شیخ صاحب نے بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا پہلے اس پلان کا ذرا خاکہ سن لو''۔

''فرمائیے''۔

''ہم اپنے گیارہ بچوں کو ولایت بھیجیں گے''۔

''کرکٹ ٹیسٹ میچ میں حصہ لینے کے لیے''۔

''تم بھی الٹی کھوپڑی کی ہو۔ کوکٹ ٹیسٹ میچ میں حصہ لینے کے لیے نہیں، آکسفورڈ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے''۔

''اس کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا''۔

''اس کی فکر نہ کرو۔ ہم اپنی زمین بیچ دیں گے۔ پھر بھی کام نہ بنا تو گھر کا اسباب فروخت کر دیں گے''۔

''یہ مسئلہ تو حل ہوا، آگے چلیے''۔

''ہم اپنا بوسیدہ مکان مسمار کر دیں گے۔ اس کے بجائے عالی شان کوٹھی تعمیر کریں گے''۔

''کوٹھی کے لیے۔۔۔''۔

''روپیہ کہاں سے آئے گا۔ تم یہی بات کہنا چاہتی ہو نا۔ کوئی نہ کوئی خدا کا بندہ دے ہی دے گا۔ آخر ہندوستان میں پچپن کروڑ انسان رہتے ہیں، یہ سب تو بخیل ہو نہیں سکتے۔ بالفرض ہمیں کسی نے روپیہ نہ دیا۔ ہم غیر ممالک میں رہنے والوں سے اپیل کریں گے کہ اس کار خیر میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ بہر حال مایوس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں''۔

''کوٹھی بھی بن گئی۔ اب اور کیا بنانے کا ارادہ ہے؟''۔

''اس کے بعد ہم ایک ڈی لکس کار خریدیں گے۔ یہ ماہانہ قسطوں پر خریدی جائے گی جنہیں ہمارا کوئی نہ کوئی دوست ادا کرے گا''۔

''فرض کیجیے ہمارا کوئی دوست قسطیں ادا کرنے پر رضامند نہیں ہوتا پھر؟''۔

''تم ایسی فضول بات فرض ہی کیوں کرتی ہو۔ یہ کیوں نہیں فرض کرتیں کہ ہمارے اتنے دوست رضامند ہو جائیں گے کہ ہمیں ہر ماہ بذریعہ قرعہ اندازی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ ان میں سے کون قسط ادا کرے گا۔ بصورت دیگر ہم اسی ہزار روپیہ قرض لیں گے''۔

''کار لینے کے بعد ہمارا اگلا پروگرام کیا ہوگا؟''۔

''اگلا پروگرام پیدا اور بڑھانا ہوگا۔ تم شاید پوچھنا چاہو گی زمین بیچنے کے بعد ہم فصلیں کہاں اگائیں گے۔ اس سوال کا صاف اور سیدھا جواب ہے اپنی کوٹھی کے آنگن میں اور کوٹھی کی چھت پر''۔

''کوٹھی کی چھت پر آپ نل چلائیں گے کیا؟''۔

''بل نہیں ٹریکٹر''۔

''پھر تو چھت کا خدا حافظ ہے''۔

''کوئی مضائقہ نہیں ہم ٹریکٹر ذرا آہستہ چلائیں گے''۔

''لیکن چھت پر جگہ ہی کتنی ہوگی؟''۔

''اس کا فہم نہ کرو۔ ہم جدید کھاد استعمال کر کے تھوڑی زمین میں زیادہ پیداوار حاصل کر لیں گے۔ تین سال کے بعد ہمیں فصل سے اتنی آمدنی ہو جائے گی کہ ہم اپنا سارا قرض ادا کر سکیں۔ اس کے بعد آنے والے چار برسوں میں ہماری خوشحالی کا وہ ٹھکانہ ہوگا کہ لوگ ہم پر رشک کیا کریں گے''۔

''تو یہ ہے آپ کے سات سالہ پلان کا مکمل خاکہ''۔

''ابھی مکمل کہاں ہے، ہم نے تمہیں یہ تو بتایا نہیں کہ کوٹھی کے دو کمروں میں پوٹری فارم کھولا جائے گا۔ پانچ سو مرغیاں پالی جائیں گی۔ ہر ایک مرغی اوسطاً دس انڈے دے گی۔ اس طرح ہمارے پاس پانچ ہزار چوزے ہو جائیں گے۔ ہر ایک چوزہ.....''۔

''آپ تو اپنے پڑدادا شیخ چلی کی طرح ہوائی قلعے بنانے لگے''۔

''پڑدادا جان تو بڑے سادہ لوح تھے۔ اگر کوئی باقاعدہ پلان بناتے تو آج ہمارے خاندان کی حالت اتنی پتلی نہ ہوئی۔ ہاں تو ہم کہہ رہے تھے ایک چوزہ دو روپے میں فروخت کیا جائے گا۔ اب ہمارے پاس دس ہزار روپیہ ہو جائے گا''۔

''اس سے شاید آپ بھیڑیں خریدیں گے؟''۔

''ہاں۔ اور بھیڑوں کی اون فروخت کر کے جو روپیہ آئے گا، اس سے ہم ایک نئی قسم کا کارخانہ لگائیں گے''۔

''یہ کارخانہ کون سا مال تیار کرے گا؟''۔

''یہ کارخانہ چھوٹے چھوٹے کارخانے تیار کرے گا۔ جیسے سیمنٹ تیار کرنے کا کارخانہ، بلیڈ بنانے کا کارخانہ، کھاد بنانے کا کارخانہ، موٹریں بنانے کا کارخانہ وغیرہ وغیرہ۔ آئندہ جس شخص کو کارخانہ لگانا مقصود ہوگا وہ ہمارے کارخانے سے بنا بنایا کارخانہ آ کر لے جایا کرے گا''۔

''تب تو ہم کروڑ پتی ہو جائیں گے''۔

''اس میں کیا شک ہے؟''۔

''اس پلان کو عملی جامہ کب پہنایا جائے گا''۔

شیخ صاحب نے بیک وقت ایک قہقہہ لگا کر کہا۔''عملی جامہ، بیگم کیا تم واقعی سمجھتی ہو۔ پلانوں کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ تم بڑی سادہ لوح ہو۔ ہم شیخ چلی کے پڑپوتے سہی، لیکن اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں پلان صرف کاغذ پر بنائے جاتے ہیں۔ جانتی ہو اگر ہم اس پلان پر عمل کریں گے ہمارا کیا حشر ہوگا۔ ہمیں زمین اونے پونے فروخت کرنی پڑے گی، کوئی مخلص ہمیں قرض دینے پر آمادہ نہ ہوگا، ہمارا کوٹھی بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا، اگر ہم اپنا بوسیدہ مکان گرادیں گے ہمیں فٹ پاتھ پر بسیرا کرنا پڑے گا، ہمارے بچے فیس ادا نہ کرسکیں گے اور انہیں آکسفورڈ سے نکال دیا جائے گا۔ مختصر یہ کہ ہماری حالت پہلے سے بھی بدتر ہو جائے گی''۔

''اگر یہ معاملہ ہے تو اتنی لاف زنی کی کیا ضرورت تھی؟''

''بیگم دہلی میں ایک بہت بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا:۔

''دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے''

''پھر بھی اسے عملی جامہ پہنانے میں حرج کیا ہے؟''۔

''ضرور جاننا چاہتی ہو''۔

''ہاں''۔

''حرج صرف اتنا ہے جب ہمارا سات سالہ پلان فیل ہو جائے گا تو ہم دونوں کو یہ نعرہ لگانا پڑے گا:۔

''پلان بناؤ اور تباہ ہو جاؤ''۔

☆☆☆

ہم نے اپنا بھارتیہ کرن کیا!

ہم نے سوچا اس سے پہلے کہ کوئی شخص ہمارا بھارتیہ کرن کرے، کیوں نہ ہم ہمت سے کام لے کر اپنا بھارتیہ کرن کر ڈالیں۔ سب سے پہلے مسئلہ ہمارے نام کا تھا جیسا کہ آپ شاید نہیں جانتے ہمارا نام اقبال چند ہے۔ ہمیں خیال آیا، اقبال، عربی کا لفظ ہے۔ ہندوستان میں رہتے

ہوئے عربی نام رکھنا کہاں کی حب الوطنی ہے۔ ہم نے اپنا نام، کنگال چند" رکھ لیا۔ یہ نام ویسے بھی ہماری مالی حالت کی غمازی کرتا تھا۔ نہ صرف ہماری بلکہ ملک کی حالت کی بھی!

دوسرا مسئلہ لباس کا تھا۔ پتلون، کوٹ اور ٹائی میں کہیں ہندوستانیت نظر نہ آئی۔ یہ تینوں چیزیں ہماری غلامانہ ذہنیت کی نمائندگی کرتی تھیں۔ بے حد تعجب ہوا ہم آج تک انہیں کیسے پہنتے رہے؟ سوچا پتلون کی بجائے پاجامہ پہنا کریں گے، لیکن کسی فارسی داں نے بتایا۔ "پاجامہ" لفظ بھی ایران سے ہندوستان میں آیا ہے۔ ہم دھوتی اور کرتہ پہننے لگے قمیص اس لیے نہیں کہ قمیص عربی کا لفظ ہے اور اس میں عرب کی بو باس بسی ہوئی ہے۔

تیسرا مسئلہ بالوں کا تھا۔ انگریزی ڈھنگ سے بال رکھنا ملک سے غداری نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم نے نائی سے کہا ہمارے سر کے درمیان ایک لمبی چوٹی رکھنے کے بعد سارے بال کاٹ دو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ قدیم ہندوستانیوں کی تصاویر میں ہم نے دیکھا تھا، وہ بڑی گھنی اور لمبی مونچھیں رکھا کرتے تھے۔ ان کی پیروی کرتے ہوئے ہم مونچھیں بڑھانے لگے۔ ہمارے چھوٹے سے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں دیکھ کر ہمارے احباب سمجھے ہم نے کسی ٹانک میں کام کرنے کے لیے بناوٹی مونچھیں لگائی ہیں۔ احباب کی بات چھوڑیئے۔ جب ہم اپنے کو اس نئے روپ میں دیکھتے، یوں محسوس ہوتا، ہمیں خدا نے نہیں شنکر کارٹونسٹ نے بنایا ہے، لیکن ہم ذرا بھی نہیں گھبرائے۔ ہندوستانی بننے کے لیے کیا کیا نہیں کرنا پڑتا۔

اب آپ ہماری عینک ہی کو لیجئے۔ ہم نے کئی پنڈتوں سے پوچھا۔ کیا رامائن اور مہابھارت میں کہیں عینک کا ذکر بھی آیا ہے؟ انہوں نے کہا۔ "اس دور میں لوگ وناسپتی گھی کہاں کھاتے تھے جوان کی بینائی جوانی ہی میں کمزور ہو جاتی"۔ ہم نے سوال کیا۔ کیا سگریو، کنجھ کرن، دوشاسن سب کی بینائی اتنی تیز تھی کہ انہیں کبھی عینک لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی؟ کہنے لگے وہ سب کاجل لگایا کرتے تھے۔ ہمیں اپنے مسئلے کے حل مل گیا۔ عینک اتار دی اور کاجل استعمال کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات کے وقت رسی پر سانپ اور بکرے پر کتے کا دھوکا ہونے لگا۔ نیز جب کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتے تو کالا اکھر بھینس برابر والا معاملہ ہوتا۔ کچھ دنوں بعد ہمیں رات کے علاوہ دن میں بھی ہر چیز پر کسی دوسری چیز کا دھوکا ہونے لگا۔ آنکھوں کے ایک ڈاکٹر سے مشورہ کیا اس نے سمجھایا۔ "اگر آپ اندھے نہیں ہونا چاہتے تو فوراً عینک لگا لیجئے"۔

''لیکن یہ ہندوستانی نہیں ہے''۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ گھڑی جو آپ نے کلائی پر باندھ رکھی ہے، ہندوستانی نہیں اور یہ سگریٹ جو آپ پی رہے ہیں، یہ بھی ہندوستانی کہاں ہے''۔

''آپ نے بہت اچھے وقت یاد دلایا۔ کل سے ہم حقہ پیا کریں گے''۔

اور گھڑی کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے''

''گھڑی اتار دیں گے''۔

''اور وقت معلوم کرنا ہوا تو؟''۔

''کسی سے پوچھ لیا کریں گے''۔

''خیر جو چاہے کیجئے، لیکن عینک ضرور لگا لیجئے نہیں تو آنکھیں نہ رہیں گی''۔

یہ سوچتے ہوئے اگر ہم اندھے ہو گئے تو ہندوستان میں اندھوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ ہم نے عینک لگالی۔

ایک رات جب ہم ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ ہمارے ایک دوست نے اعتراض کیا۔ ٹیلی ویژن ہندوستانی نہیں۔ ہم نے اس کی عقل کا ماتم کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر زمانہ قدیم میں ٹیلی ویژن نہ ہوتا تو سنجے مہاراج دھرت راشٹر کو مہابھارت کا آنکھوں دیکھا حال کس طرح سنا سکتے تھے؟''۔

''وہ تو یوگ کا معجزہ تھا''۔

''آپ اسے یوگ کا معجزہ کہہ لیجئے۔ ہم تو سمجھتے ہیں، سنجے کے پاس ٹیلی ویژن سیٹ تھا''۔

''سنجے کی وفات کے بعد وہ سیٹ کہاں گیا؟''۔

''مہابھارت کی جنگ میں تباہ ہو گیا''۔

کچھ اور دنوں کے بعد ہمارے ایک دوست نے ہم پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اپنا بھارتیہ کرن تو کر لیا، لیکن آپ بوٹ کیوں پہنتے ہیں؟''

''کل سے چپّل پہنا کریں گے''۔

جوتا پہن کر چلنے میں کافی تکلیف کا احساس ہوا کیونکہ وہ پاؤں کو بری طرح کاٹتا تھا۔ ہم نے اس کی بھی پروا نہ کی، لیکن باتیں بنانے والے کب چپ رہ سکتے تھے کہنے لگے۔ ''آپ بس یا ٹیکسی میں دفتر کیوں جاتے ہیں، رتھ یا پالکی میں جایا کیجئے''۔ ہم نے جھنجھلا کر کہا۔ ''بیسویں

صدی میں رتھ اور پالکیاں ہیں کہاں، جن میں سوار ہوا جا سکے؟''۔

''تو پھر پیدل جایا کیجئے''۔

''دفتر آٹھ میل پر ہے۔ پیدل کس طرح جا سکتے ہیں؟''۔

''تو پھر بھارتیہ کرن کا خبط چھوڑ دیجئے''۔

''وہ ہم نہیں چھوڑ سکتے''۔

وہ پھبتی کستے ہوئے بولا۔ ''آپ کی شریمتی جی تو ابھی تک لپ اسٹک اور پوڈر لگاتی ہیں ان کا بھارتیہ کرن کب ہوگا؟''

بات تلخ ضرور تھی، لیکن سچی تھی۔ ہم نے وعدہ کیا کہ شریمتی جی سے اصرار کریں گے آئندہ پان سے اپنے ہونٹ رنگا کریں اور پاؤڈر کی بجائے چندن کا لیپ کیا کریں۔

ہم نے سمجھا تھا کہ اب کوئی نکتہ چیں ہم پر الزام نہ لگائے گا کہ ہم سو فیصد ہندوستانی نہیں ہیں لیکن ہمارا خیال غلط ثابت ہوا۔ ایک شام کچھ نوجوان ہمیں مبارکباد دینے کے بہانے گھر پر آئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے پوچھا۔ ''مکمل ہندوستانی ہونے کے باوجود آپ نے ٹیلی فون کیوں لگا رکھا ہے؟''۔

''ٹیلی فون تو زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے''۔

''لیکن اس کی ایجاد ہندوستان میں نہیں ہوئی''۔

''یوں تو بجلی کی ایجاد بھی ہندوستان میں نہیں ہوئی''۔

''آپ بجا فرماتے ہیں۔ پھر بجلی کے بلبوں کی بجائے چراغ جلایا کیجئے''۔

''چراغوں سے اتنی روشنی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟''۔

''آپ نے گھر میں کرسیاں کیوں رکھی ہوئی ہیں''۔

''بیٹھنے کے لیے''۔

''قدیم ہندوستانی کرسیوں پر نہیں بیٹھتے تھے''۔

''اور کس چیز پر بیٹھتے تھے؟''۔

''فرش پر''۔

دو ایک منٹ کے سکوت کے بعد ایک نوجوان نے کہا۔ ''آپ چائے کیوں پیتے ہیں''۔

''اور کیا پیا کریں''۔

''جوشاندہ''۔

''جوشاندہ بھی کوئی پینے کی چیز ہے''۔

''پھر دودھ پیا کیجئے''۔

''دودھ ہضم نہیں ہوتا پھر مہنگا بھی ہے''۔

''آپ کے لڑکے میڈیکل کالج میں کیوں پڑھتے ہیں؟''۔

''ہم انہیں ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں''۔

''ڈاکٹر کیوں، وید کیوں نہیں؟''۔

''ہمارا آیورویدک سسٹم میں اعتقاد نہیں ہے''۔

''وہ تو خالص ہندوستانی سسٹم ہے''۔

''ہوگا۔ ہمیں پسند نہیں''۔

''باقی ہندوستانی چیزیں پسند ہیں، یہ کیوں نہیں؟''۔

''اس سوال کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں''۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ سو فی صدی ہندوستانی نہیں''۔

وہ چلے گئے، لیکن ہم عجیب وبدھا میں پڑ گئے۔ کیا اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی ہم اپنا مکمل بھارتیہ کرن نہیں کر سکے؟ کیا واقعی چراغ چلانا ہوں گے؟ جوشاندہ پینا پڑے گا؟ لڑکوں کو گرروکل بھیجنا ہوگا؟ اور یہ سب کچھ کر لیا تو نکتہ چیں کہیں گے..... آپ انگریزی اخبار کیوں پڑھتے ہیں؟ پینسلین کے ٹیکے کیوں لگواتے ہیں؟ کیک اور بسکٹ کیوں کھاتے ہیں۔ شریمتی جی کو ڈارلنگ کیوں کہتے ہیں؟

بہت دیر تک سوچنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا، اخبارات میں اعلان کر دیں۔ جہاں تک ممکن تھا، ہم نے اپنا بھارتیہ کرن کر لیا ہے۔ اس سے زیادہ بھارتیہ کرن کرنے کی ہم میں توفیق نہیں!۔

☆☆☆

غربت کا خاتمہ

''محکمہ انسداد غربت'' کے ڈائرکٹر جناب شاطر حسین شاطر بڑے ستم ظریف واقع ہوئے ہیں۔ سائل کو ایسا کرارا جواب دیتے ہیں کہ وہ بے چارہ بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اکثر بہت فخر سے فرمایا کرتے ہیں۔ ''عوام غریب ہیں تو ہم عجیب وغریب ہیں!'' چند دن ہوئے انہوں

نے ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا، جہاں مقتدر اخبارات اور رسائل کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''حکومت تہیہ کر چکی ہے کہ غربت کو ختم کر کے ہی دم لے گی۔ غربت ایک لعنت ہے اور جو حکومت اسے برداشت کرتی ہے وہ اس سے بھی بڑی لعنت ہے۔ حکومت جانتی ہے اگر اس نے غربت کو ختم نہ کیا، غربت اسے ختم کر دے گی۔ ''محکمہ انسداد غربت'' اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ عوام کو غربت سے نجات دلائی جائے۔ غربت ہمارے سماج کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے جسے بدقسمتی سے ہم جھومر سمجھتے رہتے ہیں۔ اگر غربت ختم کر دی جائے تو اس کے ساتھ کمیونزم کا بھی خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے''۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد انہوں نے نمائندوں کو سوالات پوچھنے کی دعوت دی۔

''آپ کے خیال میں غربت کو ختم کرنے کے لیے کتنا عرصہ درکار ہوگا؟''۔

''کم از کم تین سو سال''۔

''اس عرصہ میں غرباء کی کتنی ہی نسلیں راہی ملک عدم ہو جائیں گی''۔

''آپ بجا فرماتے ہیں اور شاید بوقت مرگ ان کی زبان پر میر کا یہ شعر ہوگا

''اس کی ایفائے عہد تک نہ جئے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی''

''حکومت کو غربت ختم کرنے کے لیے اتنے لمبے عرصے کی کیوں ضرورت ہے؟''

''غربت ایک دیرینہ مرض ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہمارا ملک پچھلے تین ہزار برس سے اس میں مبتلا ہے اور کسی مسیحا کا انتظار کرتا رہا ہے۔ روایتی معالجوں نے جب کبھی اس کا علاج کرنے کی کوشش کی۔ اس نے صرف ایک مصرع پڑھ کر ان کا حوصلہ پست کر دیا ع

''تم اچھا کر نہیں سکتے، میں اچھا ہو نہیں سکتا!''

''حکومت غربت کو ختم کرنے کے لیے کیا اقدامات کر رہی ہے؟''

''حکومت نے ہر وزیر کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی ہر تقریر میں غربت کو جلد از جلد ختم کرنے کا وعدہ کرے، چاہے عوام اس کی تقریر سننے کے بعد سراج لکھنوی کا یہ شعر پڑھنے پر کیوں نہ مجبور ہو جائیں۔

وہی لہجہ، وہی تیور، قسم ہے تیرے وعدوں کی
ذرا بھی شک نہیں ہوتا کہ یہ جھوٹی تسلی ہے!

اس کے علاوہ حکومت مستقبل قریب میں موم بتیاں بنانے کی صنعت اور اگربتیاں فروخت کرنے کی تجارت کو نیشنلائز کر رہی ہے"۔

"اس سے غرباء کو کیا حاصل ہوگا؟"۔

"روشنی اور خوشبو!"

"اس وقت امارت اور غربت میں جو خلیج حائل ہے، اسے پاٹنے کے لیے حکومت کیا کر رہی ہے؟"۔

"فی الحال حکومت نے مے نوشی پر "سی لنگ" (Cei-ling) لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پندرہ اگست کے بعد کوئی شخص کسی محفل میں غیر ملکی وہسکی کے دس اور ہندوستانی وہسکی کے پندرہ پیگ سے زیادہ نہ پی سکے گا۔ اس طرح جو شراب بچ رہے گی، اسے غرباء میں تقسیم کر دیا جائے گا"۔

"لیکن غریب تو ہائے روٹی، ہائے روٹی پکار رہے ہیں"۔

"جب انہیں پینے کو شراب میسر ہو جائے گی، وہ پکارنا بند کر دیں گے۔ شراب میں چاہے کتنے نقائص ہوں، ایک وصف یہ ہے کہ غم غلط کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ مجھے جوش ملیح آبادی کا ایک شعر یاد آ گیا۔ لگے ہاتھوں وہ بھی سن لیجئے"۔

اٹھا ساغر کہ انسان کشتہ آلام ہے ساقی
یہ بربط ہے، یہ مے، آگے خدا کا نام ہے ساقی!"

"شاید اسی لیے آپ جگہ جگہ شراب کے ٹھیکے قائم کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ اس سے حکومت کو دو فائدے ہوں گے۔ آمدنی میں معقول اضافہ ہوگا اور غربا شراب پینے کے بعد بھول جایا کریں گے کہ وہ غریب ہیں"۔

"لیکن حکومت نے جو مکمل شراب بندی لاگو کرنے کا عہد کیا تھا، اس کا کیا ہوا؟"۔

"وہ عہد حکومت نے نہیں گاندھی جی نے کیا تھا اور ظاہر ہے حکومت اور گاندی جی دو مختلف چیزیں ہیں!"

"پچھلے پانچ برسوں میں حکومت نے غربت کو کس حد تک ختم کیا ہے"۔

"پانچ سال ایک ملک کی تاریخ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ ابھی تک تو حکومت اعداد و شمار

بھی اکٹھے نہیں کر سکی کہ ہمارے ملک میں غرباء کی صحیح تعداد کتنی ہے اور آیا ہمارے ملک میں کوئی شخص غریب بھی ہے یا نہیں؟''۔

''کیا حکومت واقعی یہ سمجھتی ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی شخص غریب نہیں؟''

''غربت ایک اضافی ترکیب ہے۔ ممکن ہے جو اشخاص اپنے آپ کو غریب سمجھتے ہوں دراصل غریب نہ ہوں۔ وہ محض اس لیے اپنے آپ کو غریب سمجھ رہے ہوں کہ دوسرے ان کے مقابلے میں امیر ہیں''۔

''آپ کا مطلب ہے غربت پر بھی ''سی لنگ''(Cei ling) لگانا پڑے گی''۔

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ غربت پر ''سی لنگ''(Cei ling) لگانا بہت ضروری ہے''۔

''آپ کے خیال میں غربت پر نہیں بلکہ احساسِ غربت پر سی لنگ لگائی جائے گی''۔

''آپ کا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ غربت بذات خود بری چیز نہیں۔ کوئی الہامی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں غربت کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ یہاں تک کہا گیا ہے۔ مبارک ہیں غریب، کیونکہ آسمان کی بادشاہت ان کے لیے ہے۔ تکلیف دہ چیز تو احساس غربت ہے۔ علامہ اقبال نے شاید اسی احساس کو مٹانے کے لیے اپنے فرزند جاوید کو نصیحت کی تھی۔

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر''

''آپ کا خیال ہے، اگر احساسِ غربت مٹا دیا جائے تو غربت ختم ہو جائے گی''۔

''جی ہاں یہ صرف میرا ہی نہیں حکومت کا بھی خیال ہے''۔

''احساسِ غربت مٹانے کے لیے حکومت کیا تدابیر اختیار کر رہی ہے؟''۔

''حکومت کتابچے شائع کر رہی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ غربت ہر ملک میں موجود ہے۔ امیر ترین ممالک میں غریب ترین لوگ پائے جاتے ہیں۔ کمیونسٹ ممالک میں غرباء کو ''کامریڈ'' کہا جاتا ہے۔ امریکہ میں انہیں ''راندہ درگاہ'' کے مطالب سے پکارا جاتا ہے۔ آج تک کوئی ملک دعویٰ نہیں کر سکا کہ اس نے غربت کو ختم کر دیا ہے''۔

''اگر حکومت کو یقین ہے کہ وہ غربت کو ختم نہیں کر سکتی تو وہ اسے ختم کرنے کا دعویٰ کیوں کرتی ہے''۔

''دعویٰ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس سے ضمیر کو سکون اور دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ عوام کی امید بندھتی ہے کہ اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ کم از کم وقتی طور پر وہ ایک خوش آئند مستقبل کا خواب دیکھنے لگتے ہیں''۔

''لیکن جب عوام کی توقعات پوری نہ ہوں گی تو بے حد مایوس ہو جائیں گے۔ اس مایوسی کا ردعمل خطرناک ثابت ہو سکتا ہے''۔

''عوام کبھی مایوس نہ ہوں گے۔ حکومت اور محبوب کے وعدہ فردا پر اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے''۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں آج تک آپ نے کتنے لوگوں کو غربت سے نجات دلائی ہے؟''۔

''پانچ سو اشخاص کو''۔

''کیسے؟''۔

''پچھلے دنوں ہم ایک گاؤں میں گئے تھے۔ وہاں ہمیں پتا چلا کے پانچ سو اشخاص میں سے صرف پانچ غریب ہیں۔ ہم نے ان پانچوں کو گاؤں سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ اب وہاں کوئی غریب نہیں''۔

''کچھ لوگوں کا خیال ہے جب سے آپ نے غربت ختم کرنے کا عزم کیا ہے، غربت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟''

''ہم سمجھتے ہیں یہ بہت اچھا ہوا ہے۔ کیونکہ بقول غالب ع

''درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا!''

''شاطر صاحب آپ نے ہمارے سوالات کے بہت معقول جوابات دیئے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو امیر مینائی کا ایک شعر آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں''۔

''ہاں ہاں بہت شوق سے!''

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہی منصفی سے کہدو تمہیں اعتبار ہوتا؟''

☆☆☆

ذاتی مسائل

مس قتالہ: ایڈیٹر رسالہ ''صنفِ ناقص'' کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے۔ انہوں نے اس ماہ کے ''بہنوں کے سوالات'' ہمیں بھجوادیئے ہیں اور فرمائش کی ہے کہ ان کے جوابات ہم دیں۔ ساتھ ہی تاکید کی ہے، ہر سوال کا جواب ایک لفظ میں دیا جائے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے بھی کہ ''زہر دے'' اس پر یہ تاکید کہ پینا ہوگا، والی صورت حال ہے۔ ہم نے ان کے ارشاد کی تعمیل کرنے کی کوشش کی ہے:

شاہ بانو، شاہدرہ

س: میں بہت بدصورت ہوں۔ میں نے آپ کے بتائے ہوئے تمام نسخے آزمائے ہیں۔ انجام یہ ہوا کہ میں پہلے سے بھی زیادہ بدصورت نظر آنے لگی ہوں۔ اب تو آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ بتایئے مجھے کیا کرنا چاہیے؟

ج: صبر

نازک بدن، لکھنؤ

س: میں بے حد موٹی ہوں۔ ناشتے میں چار ابلے انڈے، آٹھ ٹوسٹ، تین سیب اور چار کیلے کھاتی ہوں۔ دوپہر کا کھانا چھ پراٹھوں، آدھ سیر سالن اور ایک پاؤ حلوے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس وقت میرا وزن ایک کوئنٹل اور بیس کلو ہے۔ جس چیز پر بیٹھتی ہوں وہ چور چور ہو جاتی ہے۔ اب تک چھ پلنگ 407 کرسیاں اور تین اسٹول توڑ چکی ہوں۔ بتایئے مجھے کیا کرنا چاہیے؟

ج: فاقہ

خوش باش بیگم، حیدرآباد

س: میری طبیعت بہت چڑچڑی ہے۔ بات بات پر کاٹنے کو دوڑتی ہوں۔ کسی پڑوسن سے نہیں بنتی۔ شوہر کے علاوہ بچوں سے بھی لڑتی ہوں۔ بتایئے مجھے کیا ہوگیا ہے؟

ج: مالیخولیا۔

شرافت النساء، دہلی

س: مجھے چغلی کھانے کی عادت ہے۔ ساس، نند، دیورانی، جٹھانی۔ سب کی غیبت کرنے میں لطف آتا ہے لیکن جب کبھی پکڑی جاتی ہوں تو سب اس طرح پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔ بتائیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟

ج: توبہ

مہندر کور، پٹیالہ

س: میں کہتی ہوں زیادہ سے زیادہ دو بچے ہونے چاہئیں۔ میرے شوہر کا خیال ہے کم از کم سات ہونے چاہئیں۔ اس اختلاف کی وجہ سے ہم دونوں میں اکثر جھگڑا ہو جاتا ہے بتائیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

ج: سمجھوتا

عقیلہ پروین، شکار پور

س: میں سمجھتی ہوں اپنے شوہر سے زیادہ عقل مند ہوں۔ کبھی کبھی اس حقیقت کا اس شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میں سجدے میں گر جاتی ہوں اور خداوند کریم کا شکر بجالاتی ہوں کہ اس نے مجھے بے پناہ عقل و دانش سے نوازا ہے۔ بتائیے آپ اس کیفیت کو کیا کہیں گے؟

ج: غلط فہمی

ریشم کور، سری نگر

س: میری ریشمی ساڑھی پر تین دھبے پڑ گئے تھے۔ صابن، لیموں کا عرق، چونے کا پانی استعمال کر چکی ہوں لیکن وہ غائب نہیں ہوئے۔ کوئی ایسی چیز بتائیے جس کے استعمال سے وہ غائب ہو جائیں۔

ج: قینچی

راج کماری، الہ آباد

س: مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ کروٹیں بدلتی اور تارے گنتی رہتی ہوں۔ یہاں تک کہ صبح ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسی چیز بتائیے کہ جس سے استعمال سے گہری نیند کا لطف لے سکوں۔

ج: کلوروفارم

گلبدن، بھوپال

س: میرے چہرے پر بے شمار کیل، مہاسے اور ان کے نشانات ہیں۔ کوئی ایسی چیز بتائیے جس کے استعمال سے وہ نظر نہ آئیں۔

ج: برقع

کجلا دیوی، کلکتہ

س: میں بہت صاف گو ہوں۔ ہر شخص کو اس کے منہ پر کھری کھری سناتی ہوں۔ بزرگوں تک کا لحاظ نہیں کرتی۔ بتائیے آپ اسے جرات کہیں گے یا شجاعت؟

ج: حماقت

ابلا، بنارس

س: جب میری ساس مجھے سخت سست کہتی ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، سانس پھول جاتا ہے، ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں، چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا ہے، اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اگر یہ ایک قسم کی ''الرجی'' نہیں تو اور کیا ہے؟

ج: بزدلی

شکنتلا، پٹنہ

س: میرا رنگ کالا، ہونٹ موٹے، ناک چپٹی ہے۔ میں چاہتی ہوں کسی طرح میرا رنگ گورا، ہونٹ پتلے اور ناک ستواں ہو جائے۔ بتائیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟

ج: دعا

زہرہ بیگم، رانچی

س: مجھے وہم ہو گیا ہے کہ میں دنیا کی خوب صورت ترین خاتون ہوں۔ ہیلن آف ٹرائے، قلوپطرہ، شکنتلا، شیرین اگر آج زندہ ہوتیں تو میری گرد کو بھی نہ پہنچ سکتیں۔ کوئی ایسی چیز بتایئے جو مجھے اس وہم سے نجات دلائے۔

ج: آئینہ

سرل کماری، جے پور

س: میرا شوہر مجھے بڑی بے دردی سے پیٹا کرتا تھا۔ تین سال میں خاموشی سے پٹتی رہی۔ ایک دن میں نے احتجاج کیا۔ غصے میں آ کر اس نے مجھے اتنا پیٹا کہ میں آدھ موئی ہو گئی۔ اس کے بعد وہ گھر سے چلا گیا اور آج تک واپس نہیں آیا۔ بتایئے مجھے کیا کرنا چاہیے؟

ج: شکر

خوں خوار بیگم، پشاور

س: مجھے اپنے شوہر کو پیٹنے کی عادت ہے۔ اکثر جب اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے تو مجھے بے ساختہ اثر لکھنوی کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے

ادھر سے آج وہ گزرے تو منہ پھیرے ہوئے گزرے
اب ان سے بھی ہماری بے کسی دیکھی نہیں جاتی

بتایئے مجھے کیا کرنا چاہیے؟

ج: رحم

لاڈو رانی للت پور

س: جب میں روٹھ جاتی ہوں۔ وہ پہروں مجھے مناتے رہتے ہیں، لیکن میں کسی طرح منے میں نہیں آتی۔ آپ اسے ناز و ادا کہیں گے یا کچھ اور؟

ج: ڈھٹائی

☆☆☆

چکور بھوپالی

چکور صاحب کے عجیب وغریب تخلص کی تاویل یہ ہے کہ پندرہ برس کی عمر میں انہیں ایک پنواڑن سے جس کا نام چاند تھا، عشق ہو گیا۔ متواتر پانچ سال تک اس کا دم بھرتے رہے، لیکن جب رسائی نہ ہوئی تو آپ نے چکور تخلص کیا اور شاعری کرنے لگے۔ چاند کے فراق میں متعدد غزلیں کہیں جو بعد میں ان کے مجموعوں ''نغمہ چکور'' ''فریاد چکور'' اور ''فغان چکور'' میں شامل کی گئیں۔ جب غزلیں کہتے کہتے طبیعت اوب گئی تو افسانہ نویسی شروع کر دی۔ قریب قریب اپنے ہر افسانے میں اپنی محبوبہ کو جی بھر کر رسوا کیا۔ اس کے بعد یہ دیکھتے ہوئے کہ جاسوسی ناول مقبول ہو رہے ہیں، ادب کی اس صنف پر طبع آزمائی کی اور دو درجن جاسوسی ناول لکھے۔ ان میں قتل چکور شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے چاند کے ہاتھوں اپنے قتل ہو جانے کی داستان کو نہایت رقت انگیز اور پراسرار انداز میں بیان کیا ہے۔

چکور صاحب کا خیال تھا، اگرچہ وہ بطور عاشق ناکام رہے ہیں، بحیثیت ادبی ان کی قدر کی جائے گی، لیکن افسوس ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی، کسی نقاد نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی حالانکہ وہ برابر اصرار کرتے رہے..... میں بھی شاعر ہوں خدارا مجھے تسلیم کرو۔

کسی دوست نے انہیں بناتے ہوئے کہا۔ ''چکور صاحب، جب تک ادیب اپنی مدح سرائی خود نہ کرے، کوئی شخص اسے ادیب تسلیم نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر اگر جارج برناڈ شا اپنے منہ میاں مٹھوں نہ بنتے تو انہیں شہرت کے لیے اور بیس سال انتظار کرنا پڑتا''۔ انہیں یہ مشورہ پسند آیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تازہ جاسوسی ناول ''سراغ رساں کی موت'' میں ہیرو اور ہیروئن کے مابین مندرجہ ذیل مکالمہ قلمبند کیا۔

''آج کل آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟''۔

''میں ہندوستان کے مایہ ناز شاعر، افسانہ نویس اور ناولسٹ جناب چکور بھوپالی کے مشہور ناول، قتل چکور، کا مطالعہ کر رہی ہوں''۔

''آپ کے خیال میں چکور صاحب کس پائے کے ادیب ہیں؟''۔

''میری رائے میں رابندر ناتھ ٹیگور، سرت چندر چیٹر جی اور منشی پریم چند کے بعد وہ سب

سے بڑے ہندوستانی ناولسٹ ہیں''۔

''اگر یہ صحیح ہے تو پھر وہ مقبول کیوں نہیں ہوئے''۔

''ہر عظیم ادیب کا یہی حشر ہوتا ہے۔ رابرٹ براؤننگ اور غالب کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں''۔

''مگر موجودہ دور میں تو غالب اور براؤننگ کی کافی قدر افزائی ہوئی ہے''۔

''چکور صاحب کی قدر بھی آنے والی نسلیں کریں گی''۔

''مجھے آپ کے چکور صاحب بالکل پسند نہیں''۔

''اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا مذاق حد درجہ پست ہے''۔

''لیکن نقاد انہیں کیوں منہ نہیں لگاتے؟''

''آج کل کے نقاد خود جاہل ہیں، ان سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے''۔ چکور صاحب سمجھتے تھے کہ اس مکالمے کو پڑھنے کے بعد قارئین ان پر ایمان لے آئیں گے اور ان کا شمار عظیم ادباء میں ہونے لگے گا، لیکن قارئین نے الٹا انہیں کا مذاق اڑایا اور اس قسم کی علانیہ خود ستائی کو ان کی کور ذوقی پر محمول کیا۔

جب یہ حربہ کارگر ثابت نہ ہوا تو چکور صاحب نے ایک نیا سٹنٹ (Stunt) شروع کیا۔ وہ ہر لائبریری اور بک اسٹال پر جاتے اور تصانیف چکور کا مطالبہ کرتے۔ ایک بار انہیں دہلی سے کلکتے کا سفر درپیش تھا۔ جب گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر رکتی وہ بھاگم بھاگ ریلوے بک اسٹال پر پہنچتے اور پوچھتے ''کیوں صاحب! آپ کے پاس ''فریاد چکور'' ہوگی''۔

''نہیں''

''فغان چکور؟''

''نہیں''۔

''نالہ چکور''

''نہیں''۔

تعجب! معلوم ہوتا ہے آپ کے بک اسٹال میں کوئی کام کی کتاب نہیں''۔

''نہیں صاحب۔ یہ بات نہیں۔ ہمارے پاس ٹیگور، غالب، اقبال، پریم چند کی تمام تصنیفات ہیں''۔

''جی چھوڑیے۔ یہ تو اب پرانے ہو چکے۔ نیگور کا دور ختم ہوا، اب تو چکور کا دور ہے''۔

ایک دن چکور صاحب ایک لائبریرین سے الجھ پڑے۔ موخر الذکر کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے تصنیفات چکور کو سستے درجہ کا ادب قرار دیا تھا..... چکور صاحب نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں سمجھتا ہوں جس لائبریری میں تصنیفات چکور نہیں، اسے نذر آتش کر دینا چاہیے۔ میرے نزدیک ایک اچھی لائبریری میں سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ اس میں ہندوستان کے عظیم ادیب چکور بھوپالی کی تصنیفات پائی جائیں''۔

پھر ایک دن چکور صاحب کو خاصی خوشی حاصل ہوئی۔ ایک قصبے میں انہوں نے ایک کتب فروش سے ''فریاد چکور'' کا مطالبہ کیا اور اس نے بڑی کوشش کے بعد اس کتاب کی ایک جلد ڈھونڈ نکالی۔ چکور صاحب نے اس کتاب کی قیمت دریافت کی۔ کتب فروش نے کہا۔ ''ویسے تو اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے، لیکن پچھلے دس سال سے یہ کتاب میری دوکان پر پڑی سڑ رہی ہے۔ آپ اسے مفت لے جا سکتے ہیں''۔ چکور صاحب کی ساری مسرت کافور ہو گئی اور انہیں سخت حیرت ہوئی کہ جو کتاب موتیوں میں تولنے کے قابل ہے، اس کی اتنی بے حرمتی کی جا رہی ہے۔

اس واقعے نے چکور صاحب کے دل و دماغ کو اس طرح متاثر کیا کہ وہ ایک دم سنکی اور قنوطی بن گئے۔ انسان اور انسانیت سے ان کا اعتقاد اٹھ گیا۔ اب وہ اٹھتے بیٹھتے ہر شخص کو کوسنے دیتے۔ نیز انہیں یہ وہم ستانے لگا کہ انہیں نظر انداز کرنے کے لیے ایک منظم سازش کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جس میں تمام لوگ شامل ہیں۔ اب جب کبھی انہیں کوئی موقع ملتا، وہ خوب دل کے پھپھولے پھوڑتے۔ ایک روز ''تاریخ ادب اردو'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''غضب خدا کا اس ضخیم کتاب میں ہر، ایرے غیرے کی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن اردو کے اس دیرینہ خادم کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ یہ ادبی خیانت ہی نہیں خباثت بھی ہے۔ ستم ہائے ستم ان ادبا کو آسمان پر چڑھایا گیا ہے جو ایک آدھ کتابچے کے مصنف ہیں، لیکن خاکسار کو اس لیے فراموش کیا گیا ہے وہ تین درجن ناولوں، غزلوں کے چار اور افسانوں کے چھ مجموعوں کا خالق ہے''۔

جب انہیں کسی مشاعرے میں مدعو نہ کیا جاتا تو منتظمین کو پانی پی پی کر کوستے۔ ''صاحب! آج کل تو گلے بازی اور تک بندی کا نام شاعری ہے۔ حقیقی شاعری کو کوئی پوچھتا نہیں۔ بخدا ہم وہ شعر کہتے ہیں کہ کوئی دوسرا کہے تو خون تھوک دے۔ اہل نظر جانتے ہیں سامعین ہماری غزلوں پر سر دھنتے

ہیں اور ہمارے ہر شعر پر مکرر مکرر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔لیکن اب ان عقل کے اندھوں کو کون سمجھائے کہ ہمیں مشاعرے میں مدعو نہ کر کے وہ سامعین کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کر رہے ہیں"۔

پچھلے دنوں اخبارات میں ان ادباء کی فہرست شائع ہوئی جنہیں سرکار نے ان کی ادبی خدمات کے لیے انعامات عطا کیے تھے۔اسے پڑھ کر چکور صاحب بہت سٹپٹائے کیونکہ ان کا نام فہرست میں نہیں تھا۔اب ان کا معمول ہو گیا کہ یہ فہرست ہر واقف اور دوست کو دکھاتے اور سینے پر دوہتڑ مار کر کہتے۔"اندھیر ہے صاحب اندھیر۔اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے۔کل کے چھوکروں اور ادبی عطائیوں میں انعامات تقسیم کیے جا رہے ہیں اور اردو کے اس جانے پہچانے ادیب کی نہایت بے دردی سے حق تلفی کی جا رہی ہے،لیکن افسوس کوئی خدا کا بندہ اس ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کرتا"۔

آخر جب چکور صاحب کے شکوے سن سن کر ان کا ہر دوست عاجز آ گیا تو انہیں کسی ستم ظریف نے مشورہ دیا کہ وہ سرکار کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ (Writ) دائر کر دیں۔

"رٹ دائر کر دوں!" انہوں نے چونک کر کہا۔"لیکن اس کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟"

"بیوی کے زیور بیچ دیجئے اور جب رٹ منظور ہو جائے تو اسے پھر بنوا دیجئے"۔

چکور صاحب کو یہ تجویز پسند آئی۔انہوں نے اللہ کا نام لے کر ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دی اور اب اس کے نتیجے کا انتظار کر رہے ہیں۔آپ بھی دعا کیجئے کہ اس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو ورنہ وہ قبر میں بھی آرام سے نہ سو سکیں گے!!

☆☆☆

عالموں سے ملاقات

اب آپ چاہے اسے ہماری خوبی سمجھ لیجئے یا خامی،ہم عالموں پر جان چھڑکتے ہیں۔ہمیں جب پتا چلتا ہے کوئی عالم ہمارے شہر میں آیا ہے،ہم ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر اس کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تاکہ اس سے تبادلۂ خیالات کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔

چند ماہ کا ذکر ہے،ایک عالم ہمارے شہر میں تشریف لائے۔ان کے متعلق کہا گیا،انہوں نے غالب پر سات سال تحقیق کرنے کے بعد ایک مقالہ لکھا ہے جس پر انہیں ڈی لٹ کی ڈگری

ملی ہے۔ ہم نے ان سے ملاقات کرنے کے لیے وقت مانگا۔ انہوں نے کہلوا بھیجا۔ ''ہم آپ کو صرف تین منٹ دے سکتے ہیں''۔ ہم نے اسے غنیمت جانا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد ان سے سوال کیا..... ''غالب کبھی تو زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں اور کبھی زندگی سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں، اس تضاد کی وجہ کیا ہے؟''

انہوں نے سگریٹ کے دو، ایک کش لگانے کے بعد فرمایا۔ ''حالانکہ ہم نے غالب پر کام کیا ہے، لیکن وہ ہمیں بالکل پسند نہیں۔ دراصل غالب ایک سپاہی زادہ تھے۔ انہوں نے تلوار کی بجائے قلم اٹھا کر بڑی غلطی کی۔ اس غلطی کا خمیازہ ان کے علاوہ ان کے مداحوں کو اٹھانا پڑا۔ اگر وہ ایک سپاہی کی حیثیت سے میدان جنگ میں اپنے جوہر دکھاتے تو بہت اچھے رہتے۔ انہیں معقول تنخواہ ملتی اور فاقہ کشی سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جاتی''۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کی۔ ''آپ شاید بجا فرماتے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری میں جو تضاد.....''

''ہم اسی تضاد کی تشریح کر رہے ہیں۔ دیکھئے، غالب دراصل فارسی کے شاعر تھے۔ انہوں نے خود کہا ہے میری اردو شاعری بے رنگ ہے۔ اگر آپ میری شاعری سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو میرا فارسی کلام ملاحظہ فرمایئے۔ غالب ساری عمر یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ انہیں اردو میں شاعری کرنا چاہیے، یا فارسی میں؟ معلوم ہوتا ہے کوئی غیبی طاقت انہیں اردو میں طبع آزمائی کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ ستم یہ کہ وہ فارسی میں کہتے مگر بدقسمتی سے اسے اردو سمجھتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کوشش کرنے کے باوجود وہ اردو میں شاعری نہ کر سکے۔ اردو میں شاعری کی ہے میر تقی میر نے، شیخ ابراہیم ذوق نے اور نظیر اکبر آبادی نے۔ غالب نے اردو میں پہیلیاں کہی ہیں۔ معمے مرتب کیے ہیں، شاعری نہیں کی''۔

''معاف کیجئے۔ آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا''۔

''دیکھئے صاحب! جب غالب نے اردو میں شاعری نہیں کی، اس میں تضاد کا سوال پیدا نہیں ہوتا، بہر حال ہم آپ کو مشورہ دیں گے، آپ اس کی زیادہ فکر نہ کیجئے، یہ غالب کا ذاتی مسئلہ ہے۔ اس ضمن میں آپ کو اقبال کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔ انہوں نے خدا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

ہماری رائے میں آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے۔ اگر آپ کوئی اور بات پوچھنا چاہتے ہیں تو پوچھ سکتے ہیں"۔

"غالب کی سرے سے کوئی پرائیویٹ زندگی نہ تھی۔ وہ ہمیشہ شاگردوں سے گھرے رہتے تھے۔ ان کی ہر بات پبلک ہوا کرتی تھی۔ وہ جب تنہا بھی ہوتے، عالم خیال میں اپنے شاگردوں کو پکارتے..... "ارے بھئی مرزا ہرگوپال تفتہ کہاں ہو؟ میاں الطاف حسین حالی کس، حال میں ہو"؟

یہ غالب کی بدنصیبی تھی کہ انہیں کبھی مکمل تنہائی نصیب نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا بھی ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اس سوال کے بعد ہم نے کوئی اور سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔

دو، ایک ہفتہ کے بعد ایک اور عالم یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لیے آئے۔ وہ شیکسپیئر پر حرف آخر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہمیں بھی شیکسپیئر سے عشق ہے۔ ہم ان کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ چند پروفیسروں کو یہ نکتہ ذہن نشین کرا رہے تھے ..... "اگر شیکسپیئر ڈرامے نہ لکھتا تو وہ بہت کامیاب جاسوسی ناول لکھ سکتا تھا"۔

ہم نے پوچھا۔ "وہ کیسے"؟

"شیکسپیئر کے ڈرامے سنسنی خیز واقعات کے گرد گھومتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ہیملیٹ، ایک مقتول، دو قاتلوں اور ایک سراغ رساں کی داستان ہے۔ ایک ذہین سراغ رساں کی طرح ہیملیٹ قاتلوں کا سراغ لگاتا ہے، لیکن وہ فطرتاً بزدل اور کم ہمت ہے، اس لیے ملزموں کو پولیس کے حوالے کرنے کی بجائے خود قتل ہونے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے"۔

"بہت خوب!" ایک پروفیسر نے انہیں داد دیتے ہوئے کہا۔

ہم نے ان سے پوچھا۔ "آپ کی دانست میں شیکسپیئر کی عظمت کا راز کیا ہے"؟

انہوں نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "یہ امر بحث طلب ہے کہ شیکسپیئر واقعی عظیم تھا۔ یہ

صحیح ہے پچھلے چار سو سال میں اس سے بڑا ڈرامانٹ پیدا نہیں ہوا، مگر اس کی کیا گارنٹی ہے کہ آئندہ چار سو سال میں اس سے بہتر ڈرامانٹ پیدا نہ ہوگا، اس لیے اسے عظیم کہنا قبل از وقت ہے"۔

ہم نے ان کی اس دلیل سے مرعوب نہ ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ موجودہ ادب میں شیکسپیئر کا ایک خاص مقام ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے"؟

انہوں نے فوراً جواب دیا۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ شیکسپیئر، شیکسپیئر ہے۔ اور اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں، ایسا کیوں ہے تو ہم کہیں گے یہ اس کی مجبوری ہے۔ آخر وہ ڈانٹے، ٹالسٹائی اور کالی داس تو ہو نہیں سکتا"۔

ایک بار ہم ایسے عالم سے ملنے گئے جو ویدانت کے مفسر سمجھے جاتے تھے۔ ہم نے ان سے درخواست کی کہ چند جملوں میں ویدانت کی تشریح کریں۔ انہوں نے چٹک کر فرمایا: "خدا جانے آپ ویدانت کو کیا سمجھتے ہیں۔ ویدانت تو ایک سمندر ہے، اسے کوزے میں کس طرح بند کیا جا سکتا ہے، اگر ہم چھ مہینے اس کی وضاحت کرتے رہیں تو بھی یہ ویدانت کی محض تمہید ہوگی!"

ہم نے بہت ادب سے عرض کی۔ "یہ تو آپ صحیح فرماتے ہیں۔ لیکن ہم نے تو صرف آپ سے ویدانت کی عام فہم تشریح کرنے کے لیے التجا کی تھی"۔

انہوں نے ہمارا مذاق اڑاتے ہوئی کہا۔ "ویدانت کوئی الجبرے کا فارمولا نہیں جو چند لفظوں میں بیان کیا جا سکے۔ اسے سمجھنے کے لیے مطالعہ کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے وید پڑھیے، پھر شاستر، پران اور اپنشد۔ اس کے بعد جو کچھ پڑھا ہے، اس پر چند برس غور کیجیے۔ پھر ہمارے پاس آیئے، ہم آپ کو بتائیں گے ویدانت کیا ہے"؟

ہم نے آہستہ سے کہا۔ "اگر اتنی فرصت یا قابلیت ہوتی تو آپ کے پاس کیوں آتے"؟

انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "واقعی آپ نے ہمارے پاس آ کر غلطی کی ہے۔ دیکھیے آپ ویدانت کے چکر میں نہ پڑیے۔ اگر آپ اتنے سال ویدانت کے بغیر زندہ رہ سکے ہیں تو جو تھوڑی سی زندگی رہ گئی ہے وہ بھی اس کے بغیر گزار سکتے ہیں۔ آپ شاید نہیں جانتے سنگیت اور ویدانت کو سمجھنے کے لیے ایک جنم کی نہیں کئی جنموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکبر نے ایک بار تان سین سے پوچھا تھا، انسان کتنے برسوں میں کسی ساز کو بجانے میں مہارت حاصل کر سکتا ہے؟

تان سین نے جواب دیا تھا۔ "مہابلی! اگر وہ مسلسل سات جنم ریاض کرے تو شاید صحیح ڈھنگ سے

تان پورا بجا سکے گا؟ دیدانت تو سنگیت سے بھی مشکل ہے۔ بہر کیف یہ آپ کے بس کا روگ نہیں"۔

ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اب سنا ہے اگلے ہفتے ایک ماہر نفسیات ہمارے شہر میں تشریف لا رہے ہیں۔ ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوں گے۔ دیکھئے وہ نفسیات کے بارے میں کیا کہتے ہیں!!

☆☆☆

ملک ادب کے بانکے

ایک زمانہ تھا کہ، بقول رتن ناتھ سرشار لکھنؤ کے بانکے بڑی آن بان کے ساتھ گھروں سے نکلتے اور اینٹھتے ہوئے بازاروں میں سے گزرتے تھے۔ ان کے رعب اور دبدبے کا یہ حال تھا کہ کوئی شخص ان کے سامنے آنے یا ان سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ ذرا سی بات پر کمر سے پیش قبض نکالنا اور مرنے مارنے پر تیار ہو جانا ان کا شیوہ بن چکا تھا۔ بیسویں صدی میں لکھنؤ کے بانکے قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ اب تو ملک ادب کے بانکوں کا دور دورہ ہے۔

ملک ادب کے بانکے پیش قبض کا کام زبان سے لیتے ہیں۔ ان کا خنجر وہ علم ہوتا ہے جسے وہ کام پر نہیں بلکہ جیب میں رکھ کر گھر سے نکلتے ہیں اور اس قہوہ خانے کا رخ کرتے ہیں جہاں ان کا استقبال کرنے کے لیے ایک خاص قماش کے لوگ پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی ان کا حلیہ ملاحظہ کرنے کا موقع ملا ہو تو آپ نے ضرور محسوس کیا ہوگا، ان پر خسرو کا مشہور مصرع صادق آتا ہے۔

بسیار خوباں دیدہ اما تو چیزے دیگری

سر کے بال بڑھے ہوئے، صورت اجاڑ، بے نور آنکھیں، لباس نہایت غلیظ۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک۔ منہ میں کسی گھٹیا برانڈ کا سگریٹ جس کے وہ کش پر کش لگاتے ہیں اور زندہ و مرحوم ادباء پر طعن و تشنیع کے تیر پر تیر چلاتے ہیں۔ اسے ان کی تیر اندازی کا کمال سمجھئے کہ کوئی ادیب ان کی زد سے بچ نہیں سکتا۔ ملک ادب کے بانکوں میں ایک خاص وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے علاوہ کسی شخص کو ادیب تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک 1970ء تک کے ادب کا شمار خرافات میں ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب سے انہیں اتنی "الرجی" ہوتی ہے کہ ادھر آپ نے کسی ممتاز ادیب کا نام لیا، ادھر جھٹ ان کو چابی لگ گئی۔ "اجی چھوڑیئے، یہ آپ کیا قصہ لے بیٹھے۔ آخر میر،

غالب، ذوق اور مومن نے لکھا ہی کیا ہے جس پر آپ فخر کر رہے ہیں۔ یہ تمام یاسیت اور قنوطیت کے شکار اور پرستار تھے۔ عمر بھر اپنی تنگ دستی، فاقہ مستی اور بیچارگی کا رونا روتے رہے۔ میر تو اس قدر روئے کہ تعجب ہوتا ہے ان کی بینائی کس طرح قائم رہی۔ ہر تیسرے شعر میں اپنے رونے کا یوں ذکر کرتے ہیں۔ جیسے بڑا تیر مارا ہو۔ بھلا ایسا شاعر بھی کیا جو رونے کو مستقل پیشہ اور روزگار بنالے۔ غالب نے مے نوشی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ انہیں قرض کی مے پینے میں کوئی عار نہ تھی۔ دراصل وہ ایک طرح کے ذہنی مریض تھے۔ ذوق کی شاعری پند و نصائح کا پلندہ ہے۔ انہیں تو شاعر کی بجائے مُلّا ہونا چاہیے تھا۔ باقی رہے مومن ان کی شاعری میں وہی گل و بلبل کی تکرار ہے جس پر لاحول پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی، لیکن ہم لکیر کے فقیر قدیم شاعری کو سینوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ آپ ہی انصاف سے کہئے، ایٹم اور جیٹ پلین کے دور میں اس قسم کی شاعری کی کیا وقعت اور ضرورت ہے۔''

وہ اپنی تنقیص ختم کر کے ایک اور سگریٹ سلگاتے ہیں۔ اس کا دھواں آپ کے منہ کی طرف چھوڑتے ہوئے ایسا ''پوز'' بناتے ہیں گویا انہوں نے قدیم شعراء کے علاوہ آپ کو بھی نیست و نابود کر دیا ہے۔ آپ ان سے لاکھ کہیں جس شاعری کو وہ فضول اور لغو سمجھ رہے ہیں، وہ ہمارے ادب کی آبرو ہے اور گل و بلبل محض استعارے ہیں جن کا سہارا لے کر قدیم شعراء نے غم دوراں کی تفسیر کی ہے۔ لیکن انہیں یقین نہیں آئے گا۔ وہ دو چار غیر ملکی نقادوں کا حوالہ دے کر کہیں گے۔ اس قسم کی جذباتی شاعری صرف کالج کے لونڈوں کو متاثر کر سکتی ہے۔

ملک ادب کے بانکے فرانسیسی یا اطالوی ادباء کو اپنا پیر و مرشد مانتے ہیں۔ ان میں سے ایک قہوے کے دو چار گھونٹ بھرنے کے بعد کہتا ہے۔ ''سارتر نے کیا خوب کہا ہے۔ زندگی بے معنی اور لغو ہے''۔ دوسرا اس کی تائید کرتے ہوئے کامیو کے ناول ''اجنبی'' کا حوالہ دیتا ہے۔ تیسرا یہ محسوس کرتا ہے کہ سارتر اور کامیو کا اپنا اپنا مقام ہے، لیکن البرٹو مورا ویہ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ چوتھا جدید ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ جاندار ادب کی تخلیق تو صرف اٹلی میں کی جا رہی ہے اور ادھر ہم ہیں کہ ابھی تک کبیر اور تلسی داس کی مدح سرائی میں مصروف ہیں۔

کبیرا کھڑا بازار میں سب کی مانگے خیر
نہ کاہو سے دوستی نہ کاہو سے بیر

''سبحان اللہ! کیا اچھوتا فلسفۂ حیات ہے''۔

اس پھبتی پر سب باتوں کی باچھیں کھل اٹھتی ہیں۔ متقدمین کا فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ ہم عصروں کا پوسٹ مارٹم کرنے لگتے ہیں۔

''آپ نے پروفیسر میم کا ناول پڑھا''؟

''بکواس ہے''۔

''میری رائے میں اب پروفیسر میم کو لکھنے سے توبہ کر لینی چاہیے''۔

آپ بجا فرماتے ہیں۔ جب ادیب سٹھیا جائے وہ ایک دم بور بن جاتا ہے''۔

''بور نہیں۔ سپر بور (Super bore)

''مجھے پروفیسر میم پر غصہ کی بجائے رحم آتا ہے''۔

''آج کل بیشتر ادباء قابل رحم ہیں''۔

''آپ نے مس جیم کی کہانیوں کا نیا مجموعہ دیکھا ہوگا؟''

''میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا مس جیم کیا لکھتی ہیں؟''

''میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں وہ کیوں لکھتی ہیں؟''

''غضب تو یہ ہے کوئی نقاد بھی انہیں لکھنے سے منع نہیں کرتا''۔

''ان دنوں نقاد ہیں کہاں۔ یا وہ گوئی کو تو تنقید نہیں کہتے''۔

''یا وہ گوئی بھی برداشت کی جا سکتی ہے، لیکن جب وہ بزعم خود کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس کا کوئی علاج نہیں''۔

''علاج تو ہے، بشرطیکہ آپ ہمارا فارمولہ استعمال کریں''۔

''وہ کیا ہے؟''۔

''اس کی وضاحت کے لیے آپ کو ایک قصہ سننا پڑے گا''۔

سب بانکے ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں۔ ان کا ساتھی اپنی روداد لہک لہک کر بیان کرتا ہے۔ جب ہمارا ناول زندگی کی موت، شائع ہوا۔ ایک ایڈیٹر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سے فضول اور بیہودہ ناول ہم نے آج تک نہیں پڑھا''۔ ہم نے اس گستاخ ایڈیٹر کو

سبق پڑھانے کا فیصلہ کیا، ان کے دفتر میں پہنچے اور اپنا تعارف کرانے کے بعد ان سے عرض کی۔ ایک پرائیویٹ بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیں ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ ہم نے دروازہ بند کرنے کے بعد ایڈیٹر صاحب کے رخسار مبارک پر دو تھپڑ رسید کیے اور کہا۔ ''آداب عرض! آئندہ ذرا سوچ سمجھ کر ادباء کی پگڑی اچھالئے گا۔ نہیں تو خاکسار کو دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا پڑے گا''۔

یہ دلچسپ قصہ سن کر بانکے ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہیں، جس کا مطلب ہوتا ہے ایسے ایڈیٹر کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہونا چاہیے تھا۔

قہوے کا دوسرا دور چلتا ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک ہر ایک ادیب شہرت کو موت کے گھاٹ اتار نہیں دیا جاتا۔ اس کے بعد بانکے کافی ہاؤس سے اینٹھتے ہوئے نکلتے ہیں اور سڑک پر یوں اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں جیسے زبان حال سے کہہ رہے ہوں۔

کسی نے ہماری طرح سے انیس
عروس سخن کو سنوارا نہیں ہے

☆☆☆

ماسٹر کرامت

خدا بخشے ماسٹر کرامت بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ مگر افسوس انہوں نے پیشے کا انتخاب کرنے میں دور اندیشی سے کام نہ لیا۔ طبعاً اور فطرتاً وہ ایک اداکار تھے۔ لیکن انہیں فارسی زبان سے عشق تھا، اس لیے ایک مڈل اسکول میں فارسی پڑھانے پر رضامند ہو گئے۔ اداکاری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ پڑھاتے وقت اکثر بھول جاتے۔ یہ اسکول کا کمرا ہے تھیٹر نہیں۔ طلبہ کو خاص تھیٹریکل انداز میں ڈانٹتے ہوئے کہتے۔ کم بختو! سیاہ بختو تم کندۂ ناتراش، بدسیرت بدقماش ہو۔ یاد رکھو استادوں کا منہ چڑاؤ گے تو منہ کی کھاؤ گے۔ تمہیں ہزار بار سمجھایا۔ حیف صد حیف تمہاری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

نہ سمجھا عمر گزری اس بت خود سر کو سمجھاتے
پگھلا کر موم ہو جاتا اگر پتھر کو سمجھاتے

شرم تم کو مگر نہیں آتی۔ یعنی تمہارے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں جب تمہارے مستقبل پر نظر دوڑاتا ہوں تو جو تمہارا حشر ہونے والا ہے اس کے تصور سے کانپ جاتا ہوں۔

تباہی کے خواب آ رہے ہیں نظر سب
مصیبت کی ہے آنے والے سحر اب

ماسٹر کرامت نے اداکاری کی تربیت پارسی تھیٹر میں حاصل کی تھی۔ وہاں سے ہی انہوں نے ایسی مکالمے ادا کرنے کا فن سیکھا جن کے الفاظ آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں اور جن کا کلائمیکس ایک ایسا شعر ہوتا ہے جو سامعین کو تالیاں پیٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ بہترین مکالمہ جسے ادا کرنے کا ہمیں فخر حاصل ہوا یہ تھا۔ ''چاروں طرف فوارے چھوٹتے ہیں۔ گویا آسمان سے تارے ٹوٹتے ہیں''۔ اور بہترین شعر جسے سن کر سامعین تین منٹ تک تالیاں پیٹتے رہے۔ داغ کا شعر تھا۔

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

اور اس کے ساتھ ہی دامن کو نچوڑا، اسٹیج پر اتنا پانی گرا جس سے واقعی دو ایک فرشتے وضو کر سکتے تھے۔ سامعین یہ ڈرامیٹک ٹچ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ اسے حالات کی ستم ظریفی سمجھئے کہ ماسٹر کرامت کو مدرس بننے پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ جب درسی کتب کو پڑھتے اور پڑھاتے، دانت پیس کر رہ جاتے۔ یہ کیسی خشک اور بے جان نثر ہے، قافیہ نہ ردیف، اس پر ستم یہ کہ ورق پر ورق الٹتے جاؤ، کہیں کوئی شعر نظر نہیں آتا۔ اگر اس کی بجائے یوں ہوتا تو کتنا لطف آتا۔ ''وہ ایک مغل شہزادہ تھا، سیر و شکار کا دلدادہ تھا۔ حسن کا پرستار تھا، رندان مے پرست کا سالار تھا۔ باشعور باتمیز تھا۔ عوام میں ہر دلعزیز تھا اور اس کے بعد ایک چٹپٹا شعر

رستم رہا زمانے میں نہ سام رہ گیا
مردوں کا آسمان تلے نام رہ گیا

ماسٹر کرامت ان اداکاروں میں سے تھے جو کسی وقت بھی اداکاری کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اسکول سے گھر آتے تو بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے..... ''اے گلشن کرامت کی بلبل ہزار داستان، اے رشک خوبان جہاں! ذرا ادھر آ اور میٹھی میٹھی باتوں

سے اپنے سرتاج کا دل بہلاتا کہ تھکاوٹ دور ہو اور دل شاد و مسرور ہو۔ جب وہ ان کے نزدیک آتی اس کی طرف اشارہ کر کے یہ شعر پڑھتے

اثر لبھانے کا پیاری ترے بیان میں ہے
کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے

ایک دفعہ انسپکٹر صاحب اسکول کا معائنہ کرنے آئے۔ انہوں نے ماسٹر کرامت سے دریافت کیا۔ ''کیا یہ صحیح ہے کہ بقول ہیڈ ماسٹر صاحب آپ ہر روز دیر سے آتے ہیں۔ آپ کے طلبہ کا نتیجہ ہمیشہ خراب نکلتا ہے۔ آپ انہیں بڑی بے رحمی سے پیٹتے ہیں''۔ ماسٹر کرامت نے دست بستہ عرض کی۔ ''جان کی امان پاؤں تو چند الفاظ زبان پر لاؤں صحیح صورت حال سے آپ کو اس طرح آگاہ کروں گا کہ صرف ایک شعر پڑھنے پر اکتفا کروں گا۔ شعر سماعت فرمایئے

چپ رہے ہم ادب سے محشر میں
ورنہ کس بات کا جواب نہ تھا

ماسٹر کرامت میں یہ وصف تھا، جو پارٹ ادا کرنے کے لیے انہیں دیا جاتا اسے اتنی خوبی کے ساتھ نبھاتے کہ حاضرین دم بخود ہو کر رہ جاتے۔ ایک بار لڑائی کے ایک منظر میں اپنے رقیب پر اس شدت سے تلوار کا وار کیا کہ وہ بے چارا مہینوں اسپتال میں مرہم پٹی کرتا رہا۔ ایک دن اپنے کمرے میں پاگل کے پارٹ کی اتنی نیچرل ریہرسل کی کہ کسی پڑوسی نے پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ کو فون کر دیا، جس مفرور کی آپ کو تلاش ہے وہ ہمارے محلے میں موجود ہے۔

مرحوم کی موت بھی عجیب حالت میں ہوئی۔ ٹاؤن کلب کے زیر اہتمام ڈرامہ شیریں فرہاد اسٹیج کیا گیا۔ اس میں ماسٹر کرامت کو فرہاد کا پارٹ ملا۔ آخری منظر میں انہوں نے یہ شعر پڑھا:

تری میعاد غم پوری ہوئی اے زندگی خوش ہو
قفس ٹوٹے نہ ٹوٹے لے تجھے آزاد کرتا ہوں

تو سبحان اللہ کا ڈونگرا برس گیا۔ اس داد سے متاثر ہو کر اور کچھ جوش میں آ کر انہوں نے تیشا اتنے زور سے اپنے سر پر مارا کہ وہیں بیٹھے بیٹھے جان بحق ہو گئے۔

حاضرین سمجھے ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ ابھی تالیوں کا شور سن کر اٹھیں گے اور اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ لچک لچک کر آداب عرض، آداب عرض کہیں گے۔ لیکن جب وہ چار پانچ

منٹ تک نہ اٹھے تو ڈاکٹر نے آ کر ان کی نبض دیکھی اور بڑے افسوس کے ساتھ اعلان کیا کہ کرامت صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اگرچہ مرحوم اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کی یاد اہل نظر کو ہمیشہ تڑپاتی اور گرماتی رہے گی۔ بیشک اب وہ باغ بہشت میں حوروں سے اٹھکیلیاں کر رہے ہوں گے یا تصویر حیرت بنے کسی فرشتے سے یہ کہہ رہے ہوں گے۔

زندگی آج بیک گام کہاں لے آئی
نا گہاں گردش آرام کہاں لے آئی

یا خالق کون ومکاں سے ابھر رہے ہوں گے کہ اے خدا تیری جنت میں اور تو سب کچھ ہے لیکن کوئی تھیٹر نہیں جہاں خاکسار اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے اور تشنگان شعر وسخن کی پیاس بجھائے۔

☆☆☆

نہ کاہو سے دوستی

مرزا غالب نے اپنے ایک شعر میں اعتراف کیا ہے کہ وہ آدمی سے اس طرح ڈرتے ہیں جیسے کتے کا کا ناپانی سے ڈرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں آدمیوں نے کاٹا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مرزا غالب نے یقیناً یہ شعر اپنے تلخ تجربے کی بناء پر کہا ہوگا۔ قیاس غالب ہے جن لوگوں سے وہ ڈرتے تھے، وہ ان کے احباب تھے۔ جو وقت بے وقت ان کے ہاں آدھمکتے، مفت کی شراب پیتے اور رخصت ہوتے وقت ان کی غزلیں اڑا کر لے جاتے۔ لیکن جب مرزا پر مصیبت آتی تو ان سے اس طرح آنکھیں چراتے جیسے مرزا کے ساتھ ان کی صاحب سلامت تک نہ ہو۔

ایک زمانہ تھا ہم بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ دوست بڑی نعمت ہیں۔ اس وقت ہم "ہتوپدیش" کے اس مقولے پر عمل کیا کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ساتھ دوستی کرنا چاہیے۔ دیکھئے کبوتروں کو ان کے ایک دوست نے جو چوہا تھا، جال کی قید سے آزاد کیا تھا۔ ہم سوچا کرتے تھے حالانکہ انسان کبوتر تو نہیں پھر بھی آئے دن طرح طرح کے جالوں میں پھنستا رہتا ہے جنہیں کاٹنے کے لیے چوہوں کی بجائے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم نے کئی

دوست بنائے لیکن انہوں نے ہمارے دل پر اتنے چرکے لگائے کہ ہمیں محسوس ہونے لگا، حافظ نے یہ شعر ہمارے بارے میں ہی کہا تھا۔

من از بیگا نگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

اب ہم نے کچھ دنوں سے بھگت کبیر کے اس قول کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ نہ کاہو سے دوستی نہ کاہو سے بیر۔ ہم کبیر صاحب کی طرح بازار میں کھڑے ہو کر سب کی خیر تو نہیں مانگتے۔ البتہ سب احباب سے پناہ ضرور مانگتے ہیں۔ اب ہمارا یہ خیال روز بروز پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ جس شخص نے بھی دوست بنانے کی غلطی کی ہے۔ اس نے جان بوجھ کر مصیبتوں کو دعوت دی ہے۔ ہمارا تجربہ ہے فی زمانہ ایسی بیوی مل سکتی ہے جو باتونی اور آرام طلب نہ ہو، ایسا نوکر مل سکتا ہے جو کام چور اور حرام خور نہ ہو، ایسا گھی بھی مل سکتا ہے جس میں ملاوٹ کے علاوہ گھی بھی ہو، لیکن ایسا دوست نہیں مل سکتا جس میں خلوص اور بوئے وفا ہو۔ ممکن ہے آپ سمجھ رہے ہوں ہم مبالغہ سے کام لے رہے ہیں۔ جی نہیں۔ آپ ذرا ہمارے ان دوستوں کے کارنامے ملاحظہ فرمائیں جن سے تنگ آ کر ہم نے دوستی سے توبہ کر لی۔

ہمارے ایک دوست ور ما صاحب تھے۔ اتنے زود رنج اور نازک مزاج کہ بات بات پر روٹھنا ان کا معمول بن گیا تھا۔ ادھر ہم نے کسی بات پر ان سے اختلاف کیا، ادھر وہ روٹھ گئے۔ اب ہم منت سماجت کر رہے ہیں، پندرہ سال کی رفاقت کا واسطہ دے رہے ہیں، لیکن وہ کسی طرح منے میں نہیں آتے..... ایک دن وہ کہنے لگے، اتوار کو ہمارے ہاں آیئے گا۔ ہم نے کوئی گھنگھور کو مدعو کیا ہے۔ ہم نے عرض کی، اتوار کو ہم نہیں آ سکیں گے، ہمیں فلاں جگہ جانا ہے۔ فرمایا! اگر آپ نہ آئے تو ہم آپ کو عمر بھر معاف نہ کریں گے۔ یہ ہمارے وقار کا سوال ہے۔ کوئی اور چارہ کار نہ دیکھ کر ہم اتوار کو ان کے ہاں پہنچے۔ وہاں کوئی گھنگھور سے جن کو اصل میں ''مہابور'' کہنا چاہیے، ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنی فضول سی کوتائیں سنا کر اتنا بور کیا کہ سارا ہفتہ **طبیعت** بدمزہ رہی۔ ایک بار ور ما صاحب اس لیے روٹھ گئے کہ ہم نے اپنے مضمون میں **ان کا ذکر نہیں کیا** تھا۔ ہم نے اپنی صفائی میں کہا۔ اس مضمون میں آپ کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ **انہوں نے** جواب میں ایک مصرع پڑھ دیا ع

دل ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

ایک اور دفعہ اس لیے ناراض ہو گئے کہ ہم نے اپنی نئی کتاب ان کے نام کیوں منسوب نہیں کی۔ ہم نے انہیں یقین دلایا، اس سے اگلی کتاب کا انتساب آپ کے نام کیا جائے گا۔ انہیں یہ تجویز پسند نہ آئی۔ کہنے لگے۔ یہ بھیک اس کو دیجئے جس کا خدا نہ ہو۔

ایک اور دوست شاطر صاحب تھے۔ ان کا شیوہ تھا، ہمیشہ بے وقت تشریف لاتے اور تین چار احباب کو ہمراہ لاتے۔ کبھی رات کے بارہ بجے دروازہ کھٹکھٹاتے، کبھی صبح کے چار بجے ٹیکسی کا کرایہ ہم سے دلواتے کیونکہ ہمیشہ ان کے بٹوے میں سو سو روپے کے نوٹ ہوتے۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ تعارف کراتے اور تنبیہہ کرتے کہ ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھئے گا..... یہ ہمیں جان سے بھی عزیز ہیں۔ ستم یہ کہ ان کے تمام احباب رند بلانوش ہوتے جو پینے کے بعد خرمستیوں پر اتر آتے۔ ہمیں پچاس ساٹھ روپے سے ہاتھ دھونا پڑتے اور نیند علیحدہ خراب ہوتی لیکن مرزا صاحب بوقت رخصت ہمیشہ یہ طعنہ دیتے کہ ہم نے بخیلی سے کام لیا ہے، اس لیے آئندہ وہ ہمارے گھر میں قدم نہ رکھیں گے۔ ہفتہ عشرہ بعد وہ اپنا عہد فراموش کر کے پھر تشریف لے آتے اور اپنے احباب کی موجودگی میں یہ اعلان کرتے۔ پچھلی بار آپ نے ہمیں ٹرخا دیا تھا اگر اس بار بھی وہی حرکت ہوئی تو وہ خبر لیں گے کہ یار رکھئے گا۔

ہمارے ایک ہم جماعت مدت سے بے کار تھے۔ ہمارے کالج میں ایک لیکچرار کی اسامی خالی ہوئی۔ ہم نے پرنسپل صاحب سے سفارش کر کے انہیں ملازمت دلوا دی، انہیں کوئی کام کا مکان دستیاب نہ ہوا۔ دو مہینے اپنے گھر رکھا۔ کالج میں پاؤں جمانے کے بعد انہوں نے پرنسپل صاحب سے راہ و رسم پیدا کی۔ ان کے بچوں کو منت پڑھانے لگے۔ گاہے گاہے انہیں تحفے بھجوانے لگے۔ جب ان کے منظور نظر بن گئے تو انہوں نے ہماری جڑ کاٹنے پر کمر باندھ لی۔ کبھی ان سے کہتے "ان سے بچ کر رہیے گا، یہ بڑے خطرناک آدمی ہیں"۔ کبھی کہتے یہ آپ کے خلاف ہر وقت زہر اگلتے رہتے ہیں۔ برسوں کہہ رہے تھے آپ جیسا نالائق پرنسپل سارے ایشیا میں نہیں ملے گا۔ جب ہمیں اس خدا واسطے کے بیر کا پتہ چلا۔ ہم نے ان سے شکایت کی آپ سے ایسے سلوک کی توقع نہ تھی۔ انہوں نے صاف مکرتے ہوئے جواب دیا "بخدا آپ کو غلط فہمی ہوئی، میں ایسا احسان فراموش نہیں۔ میں تو پرنسپل صاحب کو مشورہ دیا کرتا ہوں آپ کو وائس پرنسپل بنا دیں۔

چنانچہ جڑ کاٹے جائیں، پانی دیئے جائیں کے مصداق انہوں نے یہ شغل جاری رکھا۔ وائس پرنسپل صاحب کے کان کچھ اس طرح بھرے کہ جب ایک سال طلبہ کی تعداد کم ہوگئی۔ انہوں نے ہمیں ملازمت سے برطرف کردیا۔ ہم کالج سے یہ مصرع پڑھتے ہوئے نکلے۔ ع

بنایا تھا جنہیں اپنا وہ مار آستیں نکلے

آغا صاحب دس سال ہمارے دوست رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے سیکڑوں چیزیں ہم سے مستعار لیں جن میں سے کوئی چیز کبھی واپس نہیں کی۔ جو اشیاء وہ مانگ کر لے گئے، ان میں تین سو رسائل، ڈیڑھ سو کتابیں، دو درجن ٹائیاں، چھ مفلر، تین پلنگ، چار کرسیاں اور ایک بائیسکل شامل ہے۔ قرض کا ہم اس لیے ذکر نہیں کرتے کہ ہم نے ان کو قرض کبھی اس امید پر نہیں دیا کہ وہ اسے واپس کریں گے۔ البتہ وہ ہمیشہ ہمیں یقین دلاتے رہے کہ مہینے کی پہلی تاریخ کو وہ ہماری پائی پائی چکا دیں گے۔ دس برسوں میں مہینے کی وہ پہلی تاریخ کبھی نہ آئی جس کے آمد پر انہیں ہمارا قرض چکانا تھا۔

اب جب ہم نے نہ کاہو سے دوستی کے اصول پر عمل کیا ہے۔ ہم بڑے مزے میں ہیں۔ ہمیں کسی شخص کی خوامخواہ ناز برداری کرنا نہیں پڑتی۔ کوئی بن بلایا مہمان وقت بے وقت ہمارا دروازہ کھٹکھٹا کر ہمارے آرام میں مخل نہیں ہوتا۔ کسی نا ہنجار کو قرض دینے کے بعد ہمیں انتظار نہیں کرنا پڑتا کہ وہ اسے کب واپس کرے گا۔ ہم اپنا سارا وقت اپنے ذاتی مسائل کو سلجھانے میں صرف کرتے ہیں اور جب کبھی ان لوگوں کی یاد آتی ہے۔ جو بقول خود کبھی ہمارے دوست تھے تو زیر لب مسکرا کر ساحر لکھنوی کا یہ شعر پڑھ لیتے ہیں۔

دنیا میں اب خلوص ہے بس مصلحت کا نام
بے لوث دوستی کے زمانے گزر گئے

☆☆☆

مرزا کامل

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ویسے دیکھنے میں وہ بھلے چنگے نظر آتے ہیں، لیکن اپنی گفتگو میں کچھ اس انداز سے دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ سامعین انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں۔ بسا اوقات ان کے عجیب الخلقت

ارشادات پر لطائف کا گمان ہوتا ہے، لوگ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے ہیں، مرزا پر طرح طرح کے فقرے کستے ہیں، لیکن مرزا پریشان ہوتے ہیں نہ پشیمان۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ جوش کے ساتھ اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے لگتے ہیں۔

ایک مجلس میں ''مونا لیزا'' کا ذکر چل رہا تھا۔ کسی شخص نے مرزا کی رائے دریافت کی۔ انہوں نے چٹخارے لیتے ہوئے فرمایا۔ ''اجی صاحب! کیا بات ہے مونا لیزا کی۔ یونان کی یہ حسین ترین رقاصہ سکندر اعظم کی خاص الخاص منظور نظر تھی۔ کہتے ہیں جب سکندر نے ایران پر حملہ کیا وہ اس کے ساتھ گئی تھی۔ یہ بھی کہتے ہیں دارا کو سکندر نہیں مونا لیزا نے قتل کیا تھا۔ مرنے سے پہلے دارا نے مونا لیزا کو مخاطب کرتے ہوئے ایک فارسی کا شعر پڑھا تھا جس کا مفہوم اردو کے ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

ہم کو تو برباد کیا ہے
اور کسے برباد کرو گے

ایران سے مونا لیزا مصر پہنچی۔ وہاں اس کی ملاقات کلوپطرا سے ہوئی۔ کلوپطرا کے محل میں انتھونی'' نے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ کاش کلوپطرا کی بجائے مجھے تم سے عشق ہوتا''۔

اس شخص نے مرزا صاحب کو مطلع کرتے ہوئے کہا ''حضور مونا لیزا تو ایک مشہور تصویر کا نام ہے جسے لیونارڈو ڈاونچی کا شاہکار تسلیم کیا گیا ہے''۔ مرزا نے اپنے اوسان ٹھکانے رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہم گوشت پوست کی مونا لیزا کی بات کر رہے ہیں۔ یہ مونا لیزا اس زمانے میں ہوئی جب تمہارا لیونارڈو ڈاونچی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ وہی مونا لیزا ہے جس کے متعلق کہا گیا تھا، اگر اس کی ناک ذرا اور ٹیکھی ہوتی وہ آدھی دنیا کو اپنے دام محبت میں گرفتار کر سکتی تھی''۔

''ہم نے تو اس کا نام پہلی بار سنا ہے''۔

''آئندہ یاد رکھئے گا''۔

اور ایک محفل میں اس موضوع پر بحث ہو رہی تھی۔ آیا کالی داس شیکسپیئر سے بڑا ڈرامانٹ ہے یا نہیں۔ مرزا نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے یہ فتویٰ صادر کیا۔ ''کالی داس چوتھی اور شیکسپیئر سولہویں صدی میں ہوا۔ اس لیے کالی داس شیکسپیئر سے بارہ صدیاں بڑا ڈرامانٹ ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں کے پلاٹ کالی داس

سے چرائے ہیں"۔

"مثال کے طور پر؟" کسی نے سوال کیا۔

"ہیملیٹ" کا پلاٹ "شکنتلا" سے چرایا گیا ہے"۔

"ان دونوں کے پلاٹ میں کوئی مشابہت نہیں"۔

"ہے کیسے نہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے ہیملیٹ پڑھا ہے نہ شکنتلا"۔

"آپ ہی بتایئے ان دونوں کے پلاٹ میں کون سی چیز مشترک ہے"۔

"دونوں میں ایک ہیرو جو ہیروئن سے محبت کرتا ہے"۔

"یہ بات تو آپ ہر ڈرامے کے متعلق کہہ سکتے ہیں"۔

"ہرگز نہیں۔ جارج برنارڈ شا کے ڈراموں میں نہ ہیرو ہوتا ہے نہ ہیروئن۔ صرف جارج برنارڈ شا ہوتا ہے"۔

ایک دفعہ دو اشخاص میں ایک شعر کے متعلق جھگڑا ہو گیا۔ دونوں مرزا کے پاس پہنچے اور ان کی رائے طلب کی۔ مرزا نے کہا شعر پڑھئے۔ شعر پڑھا گیا۔ انہوں نے دو ایک بار خود پڑھا اور فرمایا، واقعی بے نظیر شعر ہے:

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

مرزا صاحب! میں کہتا ہوں یہ شعر غالب کا ہے۔ میرے دوست کی رائے ہے ذوق کا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟"

"حضرات! آپ دونوں غلطی پر ہیں۔ یہ شعر غالب کا ہے نہ ذوق کا۔ دراصل اسے تین شاعروں نے مل کر کہا اور وہ تھے جناب دل شاہجہاں پوری، جناب جگر مرادآبادی اور محترمہ ادا بدایونی۔ ثبوت اس بات کا یہ کہ تینوں کے تخلص شعر میں موجود ہیں"۔

اس طرح کا ایک اور واقعہ اس دن ہوا جب ایک طالب علم نے مرزا سے فانی کے اس شعر کی تشریح کرنے کے لیے کہا:

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

مرزا نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ ایک مزاحیہ شعر ہے۔ عاشق اپنی محبوبہ کو ڈرانے کے لیے کفن میں گھس جاتا ہے۔ دو ایک منٹ مردے کی طرح لیٹ رہنے کے بعد مردہ سکوت توڑتا ہے اور محبوبہ کی پیرقی پر طنز کرتے ہوئے اسے کفن سرکانے کی دعوت دیتا ہے۔ ظاہر ہے وہ اس چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہو رہا ہے ورنہ اگر اس کی واقعی موت ہو گئی ہوتی تو وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکتا، چہ جائیکہ شعر کہہ سکے''۔

حالانکہ مرزا نے کسی غیر ملک کی سیاحت نہیں کی۔ تاہم جب کوئی شخص کسی بیرملک کا ذکر چھیڑتا ہے وہ اس میں دخل دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ایک نوجوان جو لندن سے لوٹا تھا ''ہائیڈ پارک'' کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا۔ مرزا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں! ہائیڈ پارک انگلینڈ کی سب سے بڑی کھالوں کی منڈی ہے۔ وہاں ہر قسم کے جنگلی جانوروں کی کھال مل جاتی ہے۔ ہمیں یاد ہے ہم کے وہاں ایک لومڑی کی کھال دو پونڈ میں خریدی تھی''۔

''لیکن صاحب! ہائیڈ پارک کھالوں کی منڈی نہیں۔ ایک پارک کا نام ہے جہاں تقریر کی مکمل آزادی ہے''۔

''آپ کا قیاس بالکل غلط ہے۔ اگر یہ محض پارک ہوتا پھر اس کا نام ہائیڈ پارک رکھنے کی کیا ضرورت تھی''۔

اور کل شام تو مرزا کامل نے کمال ہی کر دیا۔ جب ایک مصری سیاح نے ان سے دریافت کیا۔

''آپ کبھی مصر بھی گئے ہیں؟''۔

''جی ہاں کئی بار مصر جانے کا اتفاق ہوا ہے''۔

''اہرام مصر بھی دیکھے؟''۔

''دیکھے''۔ مرزا نے چونک کر کہا۔ ''انہی کے ہاں تو ہمارا قیام رہا۔ وہ ہمارے جگری دوست ہیں۔ مصر میں ان سے بڑھ کر مہماں نواز روشاید ہی ہوں گے''۔

''اور ابوالہول؟''

''اوہ مولانا ابوالہول۔ ان سے ایک قہوہ خانے میں ملاقات ہوئی تھی۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ بہت دیر تک مصر اور ہندوستان کی پرانی تہذیبوں سے متعلق گفتگو کرتے رہے''۔

اب مصری سیاح کے چونکنے کی باری تھی۔ ''لیکن مرزا صاحب اہرام مصر تو مینار ہیں اور

ابوالہول ایک بت کا نام ہے، جس کا چہرہ عورت اور دھڑ شیر کا ہے"۔

مرزا صاحب نے ذرا بھی..... نہ جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ "دیکھئے صاحب! جب ہم مصر گئے تھے تب تو اہرام مصر کا شمار روسا میں ہوتا تھا۔ اور ابوالہول مولانا کہلاتے تھے۔ اب اگر گردش زمانہ سے وہ میناروں اور بت میں تبدیل ہو گئے ہوں تو ہم کہہ نہیں سکتے"۔

مصری سیاح نے غالب کا مصرع زیر لب دہرایا..... ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے..... اور خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا

روشن کباڑی نے ایک عجیب وغریب چراغ کہ جس پر چند الفاظ کسی اجنبی زبان میں کندہ تھے، مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں یہ وہی چراغ ہے جس کی تلاش آپ برسوں سے کر رہے ہیں"۔

میں نے فوراً وہ چراغ خرید لیا اور اپنی قیام گاہ کا رخ کیا۔ کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے کے بعد میں نے اسے روشن کیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اسے میں سے لال رنگ کے دھوئیں کا غبار سا اٹھا، جس نے آہستہ آہستہ ایک جن کی صورت اختیار کر لی۔ یہ جن ان تمام جنوں سے مختلف تھا جن کا ذکر قصے کہانیوں میں آتا ہے۔ وہ نیکر اور بش شرٹ میں ملبوس تھا اور ڈیل ڈول میں فلمی ٹارزن سے مشابہت رکھتا تھا۔ اس نے عربی کے بجائے انگریزی میں مجھے گڈ مارننگ کہنے کے بعد پوچھا۔ "کہئے مجھے کیسے یاد فرمایا؟"

میں نے گھبرا کر جواب دیا۔ "یونہی کوئی خاص بات نہیں ویسے ہی..... میرا مطلب ہے۔ یعنی....."

"دیکھئے گھبرانے یا شرمانے کی ضرورت نہیں۔ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"خدمت! مجھے کس چیز کی ضرورت نہیں۔ میرا مطلب ہے فی الحال"۔

"آپ خواہ مخواہ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔ کہئے آپ کی خدمت میں ہالی وڈ کی خوبصورت ترین ایکٹریس پیش کر دوں؟ آپ کو وہ راکٹ لا کر دوں جس کی مدد سے آپ چاند

کی سطح پر اتر سکتے ہیں یا آپ کو کسی بڑے ملک کا وزیر اعظم بنا دوں"۔

میں نے پہلے سے بھی زیادہ گھبرا کر کہا۔ "نہیں۔ نہیں۔ مجھے ہالی وڈ کی ایکٹریس کی ضرورت نہیں میں شادی شدہ ہوں۔ میں چاند کی سیر بھی نہیں کرنا چاہتا، وہاں آکسیجن ہے نہ پانی۔ وزیر اعظم تو کجا میں پریذیڈنٹ بھی بننا نہیں چاہتا کیونکہ مجھے سیاست کا کوئی تجربہ نہیں"۔

"تو پھر شاید آپ کو دولت کی ضرورت ہے، آپ دوبارہ جوان ہونا چاہتے ہیں۔ آپ کسی دشمن سے خوفناک انتقام لینا چاہتے ہیں"۔

"نہیں۔ مجھے ان میں سے کسی چیز میں دلچسپی نہیں"۔

"تعجب!" جن نے مسکرا کر کہا۔ "آپ نے مجھے خوامخواہ بلوا بھیجا"۔

"معذرت چاہتا ہوں"۔ میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "تم جا سکتے ہو"۔

چشم زدن میں وہ غائب ہو گیا۔ مجھے اپنی کم ہمتی پر بہت ندامت محسوس ہوئی۔ میں نے فیصلہ کیا آئندہ پروگرام مرتب کرنے کے بعد ہی اسے بلواؤں گا۔ میں متواتر تین دن سوچتا رہا کہ اس کی خدمت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کس طرح اٹھایا جا سکتا ہے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اس سے کسی ذاتی مسئلے کی بجائے اجتماعی مسائل کو حل کرنے کے لیے کہا جائے کیونکہ اجتماعی مسائل کو سیاست دانوں اور قومی رہنماؤں نے کچھ اس طرح الجھا دیا ہے کہ کوئی جن ہی انہیں سلجھا سکتا ہے۔

چوتھے دن جب میں نے چراغ جلایا اور جن نمودار ہوا تو میں نے بڑی خود اعتمادی سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے سنا ہے تم مشکل سے مشکل کام کر سکتے ہو"۔

"آپ بجا فرماتے ہیں"۔

"کیا تم ان تمام ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کو جو چند ممالک کے قبضے میں ہیں، چرا کر بحر الکاہل میں پھینک سکتے ہو؟"۔

"کیوں نہیں۔ لیکن بیچارے سمندری جانوروں کی شامت آ جائے گی"۔

"تمہارا مطلب ہے وہ مر جائیں گے۔ کوئی مضائقہ نہیں، لیکن انسانیت اور تمدن تو تباہ ہونے سے بچ جائے گا"۔

"آپ درست فرماتے ہیں"۔

"اچھی جا، اور یہ کام کرنے کے بعد مجھے مطلع کرو تا کہ میں تمہیں دوسرا کام بتا سکوں"۔

''بہتر!''۔

''لیکن مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تم نے یہ فرض انجام دے دیا ہے؟''۔

''اخبارات کے مطالعے سے''۔

دوسرے دن ہر اخبار کی پہلی سرخی میں ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کی پراسرار چوری کا ذکر تھا۔ لطف یہ کہ سرمایہ دار ممالک نے کمیونسٹوں اور کمیونسٹ ممالک نے سرمایہ داروں کو اس چوری کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ لیکن میں خوش تھا کہ ایک عظیم خطرہ جو انسانیت کے سر پر مدت سے منڈلا رہا تھا ٹل گیا ہے۔

جب جن اس مہم کو سر کرنے کے بعد میرے پاس آیا تو میں نے اسے شاباش دیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے واقعی کمال کر دیا اب، اس سے بھی زیادہ مشکل کام کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں چاہتا ہوں دنیا میں جتنے بھی سیاست داں ہیں وہ راتوں رات سب گونگے ہو جائیں''۔

''آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی''۔

صبح کو ہر ریڈیو اسٹیشن سے خبر نشر کی گئی کہ عجیب طرح کا گونگا پن جو صرف سیاست دانوں پر حملہ کرتا ہے، وبا کی طرح پھیل گیا ہے لوگوں نے یہ خبر سن کر اطمینان کی سانس لی کہ اب کوئی سیاست دان فضول بیان دے کر انہیں گمراہ کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔ ''مسٹر جن! تمہارا تیسرا کام یہ ہے کہ ہر شادی شدہ عورت کو تیس سال کے لیے اولاد پیدا کرنے کے لیے ناقابل بنا دیو''۔

''جناب! یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مستورات کے جسمانی نظام میں چند اہم تبدیلیاں نہ کی جائیں۔ اس کام کے لیے مجھے کچھ مہلت دیجئے''۔

''کیا ایک ہفتہ کافی ہوگا؟''۔

''نہیں۔ کم از کم ایک مہینا مجھے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جنوں کی پوری فوج تعینات کرنا پڑے گی''۔

ایک ماہ کے بعد جب جن سے ملاقات ہوئی تو اس نے یہ خوش خبری سنائی کہ اب ہر ایک شادی شدہ عورت عارضی طور پر بانجھ بنا دی گئی ہے۔ میں نے اسے اس کے چوتھے کام کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''تم جانتے ہو، دنیا کے کل رقبے کا صرف چوتھا حصہ خشکی ہے، باقی تین حصے پانی پر مشتمل ہے''۔

''جانتا ہوں''۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تین چوتھائی خشکی اور ایک چوتھائی پانی ہو جائے''۔

''آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں''۔

''تاکہ بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے رہائش اور خوراک کے مسائل کو حل کیا جاسکے''۔

''یہ بہت مشکل کام ہے۔ بہرحال سوچنا پڑے گا''۔

''میری دانست میں پانی کو بخارات میں تبدیل کیا جاسکتا ہے یا بڑے بڑے ریگستانوں کو اٹھا کر سمندروں میں..... پھینکا جاسکتا ہے''۔

''اس سے آپ کا مطلب حل نہ ہوگا۔ بخارات بارش کی صورت میں زمین پر لوٹ آئیں گے اور ریت پانی میں گھل جائے گی''۔

''کیا کوہ ہمالیہ کو اٹھا کر بحر ہند میں پھینک سکتے ہو''۔

''تجربہ کرنا پڑے گا۔ میں نے اتنا بڑا وزن آج تک نہیں اٹھایا''۔

''کوہ ہمالیہ نہ سہی، چٹان تو اٹھالو گے؟''۔

''کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ آپ بھی میرے ساتھ چلئے''۔

''میں چٹان اٹھانے میں تمہاری زیادہ مدد نہ کرسکوں گا''۔

''مجھے صرف آپ کی اخلاقی حمایت کی ضرورت ہے''۔

میں، جن کے ساتھ ہولیا۔ اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ایک چٹان کو جھیل کے کنارے پر تھپی، اٹھایا اور اسے پانی میں پھینکنے کے بعد ہانپنے لگا۔ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ فضا میں سیکڑوں فوارے چھوٹے۔

پانی کی لاکھوں بوندیں جب مجھ پر گریں تو یک لخت میری آنکھ کھل گئی۔ میں اپنے بستر پر دراز تھا۔ آس پاس نہ کہیں جن تھا اور نہ الہ دین کا چراغ البتہ ریڈیو پر کوئی بائی جی..... لہک لہک کر یہ مصرع گا رہی تھی۔ ع

خواب تھا جو کچھ تھا دیکھا جو سنا افسانہ تھا!

☆☆☆

مسٹر قریشی

ہمیں وہ دن کل کی طرح یاد ہے جب مسٹر قریشی ہمارے کمرے میں آئے اور یہ مژدہ سنایا۔

''آیئے۔ آپ کا تعارف ایک عظیم ہستی کے ساتھ کرائیں''۔ اس کے بعد مصافحہ کرتے ہوئے ہم سے فرمایا'' وہ عظیم ہستی ہم ہی ہیں۔ وطن بلند شہر ہے۔ جہاں والد محترم ڈپٹی کمشنر ہیں۔ ہم ان کے اکلوتے صاحبزادے ہیں۔ ان دنوں آئی۔ ای۔ ایس کے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپ چونکہ بھلے آدمی نظر آئے۔ ہم نے مناسب سمجھا آپ سے راہ و رسم پیدا کی جائے''۔

ہم نے رسمی طور پر کہا۔'' آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی''۔

مسٹر قریشی ناراض ہو گئے۔ کہنے لگے۔'' رسمی فقروں سے ہمیں چڑ ہے۔ ویسے بھی آپ کو کہنا چاہیے تھا۔ ہم سے ملاقات کر کے آپ کو ایک ناقابل بیان فخر کا احساس ہوا''۔

''اس میں کیا شک ہے''۔

''وہ اس لیے''۔ مسٹر قریشی نے اپنے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔'' ہم سو میں ننانوے اشخاص کے ساتھ گفتگو کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ خاندانی روایات کا تقاضا بھی یہ یہی ہے کہ ہر ایرے غیرے کو منہ نہ لگایا جائے''۔

ہم ان سے مرعوب ہوتے ہوئے بولے'' آپ بجا فرماتے ہیں''۔

اس دن کے بعد مسٹر قریشی سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی وضع قطع اور رہن سہن کے طور طریقوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ ڈپٹی کمشنر کے فرزند ہیں۔ جن کے خاندان کی بقول ان کے یوپی میں دھوم ہے۔ لباس نہایت غلیظ پہنتے۔ سر کے بال مہینوں نہ ترشواتے۔ ان کے کمرے میں جتنا فرنیچر تھا وہ کسی کباڑی سے اونے پونے داموں میں خریدا گیا تھا۔ اکثر تنگدست رہتے اور آئے دن پانچ دس روپے قرض لے جاتے جو شاذ و نادر ہی واپس کرتے۔

مسٹر قریشی جب کبھی اپنے خاندان کا ذکر کرتے یوں معلوم ہوتا چودہ پشت سے رئیس چلے آ رہے ہیں۔ ایک دن بتایا'' امسال فصل اچھی نہیں ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ پانچ لاکھ آمدنی ہو گی''۔ ایک اور دن کہا۔'' والد محترم نے اسی ہزار کی ایک کار خریدی ہے۔ لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں۔ کہتے ہیں ہمارے ایسے رئیس کے پاس ایک لاکھ روپے کی کار ہونی چاہیے''۔

ایک شام کو جب مسٹر قریشی ہوٹل سے غیر حاضر تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا ملاقاتی ان سے ملنے کی لیے آیا۔ بات چیت کے دوران پتہ چلا وہ قریشی صاحب کے والد محترم ہیں۔ بلند شہر میں ڈپٹی کمشنر کے کلرک ہیں۔ تھوڑی سی زمین بھی ہے۔ کنبہ کافی بڑا ہے، اسی لیے بڑی مشکل سے گزر ہوتی ہے۔ مسٹر قریشی کے متعلق انہوں نے انکشاف کیا کہ متواتر تین سال سے بی۔اے میں فیل ہونے کے بعد اب بطور پرائیویٹ امیدوار اسی امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔

جب مسٹر قریشی اپنے کمرے کو لوٹے انہوں نے اپنے والد سے ہمارا تعارف کرانا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ ان کی رخصت ہو جانے کے بعد کہا "والد محترم نے بڑی سادہ طبیعت پائی ہے۔ رئیس ابن رئیس ہونے کے باوجود نہایت معمولی لباس پہنتے ہیں"۔ اس پر طرہ یہ ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے ایسا کرنے سے مسافر فطرت انسانی کا مطالعہ کر سکتا ہے"۔

ایک اتوار کو مسٹر قریشی نے باتوں باتوں میں ہم سے پوچھا۔ "آپ کو شعر و شاعری سے بھی کچھ شغف ہے؟ جب ہم نے ان کے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ ایک بیاض نکالی اور کہا۔ "ہماری تازہ غزل سماعت فرمایئے"۔ ترنم سے غزل پڑھنے کے بعد سوال کیا "کیسی ہے؟" غزل واقعی لاجواب تھی۔ ہم نے دل کھول کر داد دی۔ اگلے روز صبح سویرے وہ ہمارے کمرے میں وارد ہوئے اور بولے "کل ایک اور غزل ہو گئی تھی لگے ہاتھوں وہ بھی سن لیجئے"۔ وہ غزل بھی ہمیں پسند آئی۔ اس کے بعد تو یہ حال ہو گیا کہ مسٹر قریشی دن میں تین تین غزلیں کہنے لگے۔ ان کا گلا کافی سریلا تھا، جب پڑھتے سماں بندھ جاتا۔ بارہا ہمیں ان کی ذہانت پر رشک آیا کہ نوعمر ہونے کے باوجود پختہ فکر ہیں۔ ہم نے سوچا ان کی امتحان میں ناکامیابی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ طبعاً اور فطرتاً شاعر ہیں۔

ہم نے انہیں مشاعروں میں شرکت کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے فرمایا "شاعروں سے ہمیں وحشت ہوتی ہے۔ اسی فیصد سامعین جاہل ہوتے ہیں۔ فضول اشعار پر داد دیتے ہیں۔ کام کے اشعار پر چپ رہتے ہیں"۔

"اگر مشاعرے ناپسند ہیں تو رسائل کو اپنا کلام بھجوا دیا کیجئے"۔

"انہیں کلام بھجوانا بے سود ہے۔ آج کل ایڈیٹروں کی تنگ ذہنی کا یہ عالم ہے وہ رباعی اور قطعہ میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ ہمارے کلام کی باریکیاں خاک سمجھیں گے"۔

ایک روز ہم مسٹر قریشی سے اپنی کتاب جو وہ مستعار لے گئے تھے، لینے کے لیے ان کے کمرے میں گئے۔ وہ غنودگی کے عالم میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔ ''ہماری الماری میں ہو گی خود ہی نکال لیجئے''۔ کتاب کی تلاش کرتے وقت اچانک ہماری نظر ایک خوبصورت فائل پر پڑی۔ اسے کھول کر دیکھا تو وہ کسی گمنام شاعر کا دیوان تھا جس میں وہ تمام غزلیں درج تھیں جنہیں مسٹر قریشی اپنی تخلیقات ثابت کرتے رہے تھے۔

کچھ اور دنوں کے بعد انہوں نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔ ہر روز ایک خوبصورت لڑکی کی فوٹو دکھاتے۔ اس کا حسب نسب بیان کرتے۔ پھر پوچھتے اگر ہم اس سے شادی کر لیں، کوئی حرج تو نہیں۔ ان میں کوئی خان بہادر کی لڑکی ہوتی۔ کوئی کسی رئیس اعظم کی دختر ہوتی اور کوئی مشہور فلم ایکٹریس۔ کیونکہ ہر ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب ہوتی، اس لیے وہ فیصلہ نہ کر سکتے کہ کس کو منتخب کیا جائے۔

ایک سہ پہر کو جب ہم کالج سے واپس آئے تو شہر کے ایک فوٹو گرافر کو مسٹر قریشی سے تکرار کرتے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''واہ! صاحب! یہ بھی خوب رہی۔ دو ماہ ہوئے دکان سے البم اٹھا لائے کہ ہمیں اپنے رسالہ کے سرورق کے لیے ایک فوٹو کا انتخاب کرنا ہے جس کے لیے آپ کو پانچ سو روپے ادا کریں گے۔ آج تک نہ البم واپس کی نہ یہ بتایا کہ کون سے فوٹو پسند آئی''۔

ہوسٹل چھوڑنے کے بعد کئی سال تک مسٹر قریشی سے ملاقات نہ ہوئی۔ ایک دن حسن اتفاق سے چاندنی چوک میں ان کی ساتھ تصادم ہو گیا۔ ان کے ساتھ ایک دبلی پتلی اور کالی کلوٹی عورت تھی جس نے دو بچوں کو اٹھا رکھا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملے کہنے لگے۔ ''بیگم قریشی سے ملیئے۔ آپ بجنور کے ایک مشہور جاگیردار کی اکلوتی صاحبزادی اور ایم۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں''۔ ہم آداب بجالائے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بیگم قریشی کے لب ولہجہ کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے۔ ایم۔ ای پی۔ ایچ۔ ڈی تو کجا وہ مڈل پاس بھی نہیں معلوم ہوتیں۔ قریشی صاحب سے یہ دریافت کرنے پر کہ ان کا کیا شغل ہے، معلوم ہوا وہ ''بے نظیر سرکس'' کے مالک ہیں جس سے انہیں بیس ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہوتی ہے۔

گذشتہ سال ہمیں ٹھہرا جانے کا اتفاق ہوا۔ شہر کی دیواروں پر ''بے نظیر سرکس'' کے اشتہار [illegible] دیکھ کر ہمیں مسٹر قریشی کا خیال آیا۔ سوچا آج رات سرکس دیکھا اور ان سے

ملاقات کی جائے۔ جونہی پنڈال میں داخل ہوئے طبیعت بشاش ہوگئی۔ واقعی یہ سرکس اسم بامسمیٰ تھی۔ کھیل شروع ہونے کے پندرہ بیس منٹ بعد دو جوکر اکھاڑے میں اترے۔ ان میں سے ایک پر ہمیں مسٹر قریشی کا گمان ہوا اور جب اس نے اپنے ساتھی کے منہ پر تھپڑ لگا کر فضول سا فقرہ کسا تو گمان یقین میں تبدیل ہوگیا۔ بڑی حیرانی ہوئی کہ مسٹر قریشی کو یہ کیا سوجھی۔ کھیل کے اختتام پر ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''آج ایک جوکر بیمار ہو گیا تھا۔ ہم نے سوچا حاضرین کو بڑی مایوسی ہوگی، اس لیے خود جوکر کا پارٹ ادا کر کے اس کمی کی تلافی کردی''۔ یہ کہنے کے بعد انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ہمارے ہاتھ پر ہاتھ مار کر پوچھا۔ ''کہئے ہماری اداکاری کیسی رہی؟'' ہم نے ان کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے جواب دیا۔ ''مسٹر قریشی! آپ تو پیدائشی اداکار ہیں۔ آپ ہمیشہ اداکاری کرتے رہے ہیں اور کچھ اس انداز سے کہ بناوٹ پر حقیقت کا گمان ہوتا رہا ہے''۔

☆☆☆

راشی پھل

اگر ہم عرض کریں، ہم نے رسائل کا وہ صفحہ پڑھنا چھوڑ دیا ہے جس کا عنوان ہوتا ہے، راشی پھل، اور جس پر مختلف راشیوں کا پھل تحریر کیا جاتا ہے، تو آپ کو یقین نہ آئے گا۔ آپ کہیں گے اشتہاروں کے علاوہ وہی صفحہ تو پڑھنے کے قابل ہوتا ہے۔ بلکہ بیشتر قارئین رسالہ خریدتے ہی اس لیے ہیں کہ اپنا راشی پھل پڑھ سکیں ورنہ آج کل رسائل میں ہوتا ہی کیا ہے۔ دو ایک اوٹ پٹانگ جدید نظمیں، تین چار غیر دلچسپ کہانیاں اور چار پانچ خشک اور فضول مضامین!

آج سے سات ماہ پہلے ہم بھی آپ کی طرح سوچتے تھے اور بہت شوق سے اپنا راشی پھل پڑھا کرتے تھے، کیونکہ اس کالم کے مصنف ایک ممتاز راج جیوتشی تھے جنہوں نے ہر ملک کے وزیراعظم کی وفات کی پیش گوئی کی تھی۔ ان میں سے کم از کم دو اس تاریخ کے آس پاس اللہ کو پیارے ہو گئے تھے جو راج جیوتشی نے بتائی تھی۔ یوں تو راج جیوتشی پیش گوئی نہ بھی کرتے، ان کے بچنے کی امید کم تھی کیونکہ ان میں سے ایک پر فالج گرا تھا اور دوسرا بڑی مدت سے دمہ میں مبتلا تھا اور سردی سخت پڑ رہی تھی۔

سات ماہ پہلے اپنا راشی پھل پڑھنے کے بعد ہم نے اسے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا، اس کی کئی

وجود ہیں۔ چار مہینے کا ذکر ہے، ہمیں ایک اعلیٰ ملازمت کے لیے دہلی سے دعوت نامہ آیا۔ ہم ٹکٹ لے کر دہلی جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔ اتنے میں ایک اخبار فروش نے ایک رسالہ کی تعریف کرتے ہوئے اصرار کیا کہ ہم اسے خرید لیں۔ رسالہ خریدنے کے بعد ہم نے فوراً راشی پھل والا صفحہ نکالا۔ ہماری راشی، کرک، کے بارے میں یہ پیش گوئی کی گئی تھی..... سفر ہرگز نہ کریں، کسی حادثے میں سخت چوٹ لگنے یا جان جانے کا احتمال ہے۔ ہم یہ پیش گوئی پڑھ کر اتنے خوف زدہ ہوئے کہ اسی وقت بس سے اتر کر گھر چلے آئے۔ بیگم نے گھبرا کر پوچھا۔ ''خیر تو ہے۔ آپ دہلی کیوں نہیں گئے؟''۔

ہم نے جواب دیا۔ ''بھاگوان! آج تو بال بال بچ گئے''۔

اس نے اور بھی گھبرا کر سوال کیا۔ ''بات کیا ہوئی؟''۔

'بات ہوئی نہیں۔ ہونے والی تھی''۔

''آپ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے''۔

ہم نے اسے راشی پھل کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم آج سفر کرنے کا خطرہ مول لیتے تو چند گھنٹوں کے بعد اسپتال میں ہوتے یا قبرستان میں! راج جیوتشی کا قول کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا۔ آپ ابھی شام کو سن لیں گی کہ جس بس میں ہم سفر کرنا چاہتے تھے، اس کی ایک ملٹری ٹرک کے ساتھ خوف ناک ٹکر ہوئی۔ آدھی مسافر جاں بحق ہو گئے۔ آدھے سخت زخمی ہوئے۔ ان میں سے دو ایک کی حالت نازک ہے!''

بیگم صاحبہ جو دہلی جانے کا خواب دیکھ رہی تھیں، کچھ مایوس سی ہو گئیں۔ ہم نے ان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو اچھا ہی ہوا جو ہم نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔ ورنہ آپ ہی کہتیں۔ اچھے گئے تھے دہلی۔ زخمی ہو کر آئے یا یہاں سے تو صحیح سلامت گئے تھے، لیکن واپس نعش آئی''۔

دوسرے دن ہم نے اخباروں میں اس خبر کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس کی سرخی ہو..... دہلی جانے والی بس اور ملٹری ٹرک میں خوف ناک ٹکر! لیکن ہمیں کسی اخبار میں ایسی خبر نہ ملی۔

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ہم نے اپنے راشی پھل میں پڑھا۔ ''اچانک کہیں سے روپیہ ملے گا''۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ معاً ہمیں ان احباب کا خیال آیا جو ہم سے قرض لینے کے بعد کچھ اس طرح غائب ہو گئے تھے کہ ان کے بارے میں گم شدہ احباب کی تلاش، کے عنوان سے اشتہار دینے کو جی چاہتا تھا۔ ہم نے سوچا ان میں سے کسی کے ضمیر نے اسے جھنجھوڑا ہو گا۔ بھلے

مانس اتنے دن ہو گئے تو قرض ادا کیوں نہیں کرتا۔ وہ بھاگم بھاگ ہمارے پاس آئے گا اور معذرت کرنے کے بعد کہے گا بہت شرمندہ ہوں۔ یہ رہے آپ کے پانچ سو روپے! میرے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ اس سے پہلے میں آپ کا قرض چکا نہ سکا، سارا دن ہم کسی ایسے دوست کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ شام تک نہ آیا۔ ہم نے بیگم سے کہا۔ اب کہیں سے تار آئے گا۔ ہمارا فلاں رشتہ دار چل بسا اور اس نے وصیت میں پانچ ہزار روپے ہمارے لیے وقف کیے۔ جب تار بھی نہ آیا تو غم غلط کرنے کے لیے سینما دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ جب ٹکٹ لے رہے تھے کسی ہوشیار جیب کترے نے..... ہمارا بٹوا اڑا لیا۔ اس میں پانچ سو کے نوٹ تھے!

اس سے اگلے ہفتے ہمارا راشی پھل اس طرح تھا۔ افسر مہربان ہوں گے۔ ممکن ہے اگلا گریڈ بھی مل جائے۔ ہم یہ خوشخبری پڑھ کر پچھلی باتیں بھول گئے۔ ہمیں خیال آیا، اگر اگلا گریڈ مل جائے تو زندگی ٹھاٹھ سے بسر ہوگی۔ دس سال سے سینئر کلرک چلے آ رہے ہیں۔ اب سپرنٹنڈنٹ کہلائیں گے۔ ہم اس مبارک ساعت کا انتظار کرنے لگے، جب صاحب اپنے دفتر میں بلوا کر یہ مژدہ سنائیں گے۔ چار بجے کے قریب انہوں نے بلوا بھیجا اور ایک کاغذ پر دستخط کرنے کے لیے کہا۔ اس پر جو لکھا تھا اسے پڑھ کر ہمارے ہوش اڑ گئے..... پچھلے دو سال سے آپ کا کام غیر تسلی بخش ہے۔ آپ کو کئی بار تنبیہ کی جا چکی ہے، لیکن آپ نے پرواہ نہیں کی۔ آج سے آپ کو جونیئر کلرک بنایا جاتا ہے۔ آپ کل اپنا چارج مسٹر علیم داس کو دے دیں گے۔

ان تین واقعات کے بعد ہمیں شک سا ہونے لگا۔ کہیں راج جیوتشی جی ہمارا مذاق تو نہیں اڑا رہے ہیں۔ وہ جو بھی پیش گوئی ہمارے بارے میں کرتے ہیں غلط ثابت ہوتی ہے۔ ہم نے انہیں رسالہ کے مدیر کی معرفت خط لکھا جس میں ان سے دریافت کیا، لوگوں کو خوامخواہ ڈرانے یا سبز باغ دکھانے میں آپ کو لطف آتا ہے؟ اگر آپ کو جیوتش کا علم نہیں آتا تو کوئی اور دھندا کیوں نہیں کر لیتے؟ چار پانچ دن کے بعد ان کا خط آیا۔ آپ تین باتیں یعنی اپنے دل پسند پھول کا نام، اپنی تاریخ پیدائش اور خط لکھنے کا صحیح وقت ایک کاغذ پر لکھ کر پانچ روپے کے پوسٹل آرڈر کے ساتھ بھجوا دیجئے۔ پھر ہم آپ کو بتا سکیں گے آپ کا راشی پھل ہمیشہ الٹا کیوں آتا ہے۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے لکھ بھیجا۔

"آپ سے سنیچر خفا ہے، اسے منانے کا اپائے یہ ہے۔ سات لاکھ سات ہزار سات سو

سات بار گائتری منتر کا جاپ کریں۔ تین ماہ تک ہر سنیچر وار کالے ناگ کو دودھ پلائیں یا کالے کتے کو میٹھی روٹی کھلائیں''۔

ان کے بتائے ہوئے اپایوں پر جب غور کیا تو پہلے دو اپائے مشکل نظر آئے سات لاکھ سات ہزار سات سو سات بار گائتری منتر کا جاپ کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ کالے ناگ کو دودھ پلانے میں تین مشکلیں تھیں۔ اوّل دودھ بہت مہنگا تھا ہم خود نہیں پی سکتے ہیں، اسے کیسے پلاتے۔ دوم ہم نے اکثر پڑھا تھا کالے ناگ کو دودھ پلانے کو کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے تو صرف اس کے زہر میں اضافہ ہوگا۔ سوم کالی ناگ بہت مشکل سے ملتے ہیں اور مل جائیں تو انہیں دیکھ کر روح فنا ہو جاتی ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا کالے کتے کو میٹھی روٹی کھلایا کریں گے۔ روٹی دودھ کے مقابلے میں سستی بھی رہے گی۔

جب پہلا سنیچر وار آیا، ہم ایک میٹھی روٹی لے کر کالے کتے کی تلاش میں چل دیئے۔ گلیوں اور بازاروں میں کئی کتے ملے لیکن ان میں کالے رنگ کا کتا نظر نہ آیا۔ ہم بہت مایوس ہوئے۔ ایک دوست کے گھر پہنچے جسے کتے پالنے کا شوق تھا۔ بدقسمتی سے اس کے تمام کتوں کا رنگ بھورا یا خاکی تھا۔ ہم گھر لوٹ رہے تھے۔ راستے میں ایک فقیر نے جو کلا بھجنگ تھا، روٹی کا سوال کیا۔ ہم نے یہ سوچتے ہوئے کہ راج جیوتشی نے اپنے خط میں کالے فقیر کا ذکر نہیں کیا، اسے روٹی دینے سے انکار کر دیا۔ اس سے اگلے سنیچر وار ایک شخص نے بتایا شہر کے سارے کالے کتوں کو میونسپلٹی نے مروا دیا ہے، کیونکہ ان میں سے دو ایک باؤلے ہو گئے تھے۔ میونسپل کمیٹی کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔ اگر انہیں تین مہینے زندہ رہنے دیا جاتا تو ہم اپائے کا پروگرام پورا کر لیتے۔

ہم نے محسوس کیا کالے کتے کی تلاش میں کسی اور شہر میں جانا پڑے گا۔ روٹھے سنیچر کو منانے کے لیے ہم نے یہ بھی گوارا کر لیا۔ ایک سنیچر وار کو ہم نے ایک قصبے کا رخ کیا۔ ابھی وہ دو فرلانگ رہا ہوگا کہ ہماری نظر ایک کالے کتے پر پڑی۔ وہ بے تحاشا ایک تالاب کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ ہم نے اسے زور سے پکارا۔ وہ ہماری طرف دوڑ کر آیا۔ اس سے پہلے کہ ہم اسے میٹھی روٹی پیش کرتے اس نے ہماری دائیں ٹانگ دبوچ لی۔ ہماری چیخ وپکار کے باوجود ہمیں تین چار جگہ کاٹ کھایا اور پھر تالاب کی طرف بھاگ گیا۔ ہم درد سے کراہنے لگے۔ اتنے میں ایک راہرو نے بتایا یہ کتا باؤلا ہے اور تین چار آدمیوں کو پہلے بھی کاٹ چکا ہے۔ اس نے ہمیں مشورہ

دیا کہ اسپتال میں جا کر ٹیکے لگوائیے۔

اسپتال میں ڈاکٹر نے بتایا مکمل کورس چودہ ٹیکوں کا ہے اور ٹیکے پیٹ میں لگائے جاتے ہیں۔ ہم ٹیکوں سے تھوڑا نہیں بہت گھبراتے ہیں، اس لیے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''اگر ٹیکے نہ لگوائے جائیں تو.....''

''آپ کو ہائیڈروفوبیا ہو جائے گا۔ اس مرض میں آدمی پانی سے ڈرتا ہے کتے کی طرح بھونکتا ہے اور آخر سسک سسک کر مر جاتا ہے!''

ہم ٹیکے لگوانے پر رضامند ہو گئے، لیکن جب اس نے پہلا ٹیکہ لگانے کے لیے دوا سرنج میں بھری، اسے دیکھ کر ہم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ ڈاکٹر تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''گھبرائیے نہیں معمولی درد ہوتا ہے جسے برداشت کیا جا سکتا ہے''۔

ٹیکہ لگوتے وقت اور اس کے بعد اتنا درد ہوا کہ ہم نے آسمان سر پر اٹھا لیا، یہ سوچ کر کہ ابھی تیرہ ٹیکے اور لگیں گے، ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔

چودھواں ٹیکہ لگوانے کے بعد ہم اسپتال سے گھر آ رہے تھے۔ گلی کے نکڑ پر ہم نے ایک فقیر کو اقبال کی مشہور غزل گاتے ہوئے سنا۔ وہ لہک لہک کر گا رہا تھا.....

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے

ہمارے جی میں آیا، اس سے کہیں..... ''ہم مجنوں ہیں نہ اقبال۔ شہر چھوڑ سکتے ہیں نہ صحرا۔ لیکن ہم وعدہ کرتے ہیں آج سے ہم نے رسائل کا وہ صفحہ پڑھنا چھوڑ دیا جس کا عنوان ہوتا ہے'' راشی پھل!!''

☆☆☆

خواجہ عیار

''یہ سب اساتذہ کا فیضان ہے ورنہ من آنم کہ من دانم!'' خواجہ عیار نے مجھے بتایا۔ میں ان سے ایک مشہور ادبی رسالہ کے لیے انٹرویو لے رہا تھا۔

''آپ کا مطلب ہے اسکول اور کالج میں جو کچھ اساتذہ نے آپ کو پڑھایا ہے، اسی کی بدولت آپ نے زندگی میں کامیابی اور ہر دلعزیزی حاصل کی؟''۔

''جی نہیں۔ اسکول ماسٹر اور پروفیسر زیادہ سے زیادہ الجبرا کے فارمولے پڑھا سکتے ہیں، یا یہ بتا سکتے ہیں کہ تاریخ انگلستان میں کتنے جارج اور کتنے ایڈورڈ ہوئے ہیں۔ جہاں تک دنیاداری کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں بالکل کورے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ساری عمر اسکول ماسٹر اور پروفیسر ہی رہتے ہیں''۔

''تو پھر آپ کی اساتذہ سے کیا مراد ہے؟''۔

''دیکھئے۔ زمانہ، قدیم میں ایک رشی دتاتریہ ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں ان کے ایک سو گرو تھے..... لطف یہ کہ بلی سے لے کر شیر تک ہر جانور اور پدی سے لے کر عقاب تک ہر پرندہ ان کا گرو تھا۔ کیونکہ بقول ان کے انہوں نے ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سیکھا تھا''۔

''بہت خوب! تو آپ نے رشی دتاتریہ کی طرح پرندوں اور جانوروں کو اپنا استاد بنایا''۔

''آپ میرا مطلب غلط سمجھے۔ پرندوں اور جانوروں کو نہیں، گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسانوں کو ہم نے.....''۔

''کیا آپ اپنی اساتذہ پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں؟''۔

''جی ہاں میرے ایک استاد حاجی صاحب ہیں۔ انہوں نے مجھے دو نایاب نسخے بتائے۔ پہلا یہ کہ ایک ناواقف کو جھک کر سلام کرنے کے بعد اس کا مزاج پوچھو۔ جب وہ حیرت کا اظہار کرے تو اس سے اپنا تعارف کرتے ہوئے نہایت خندہ پیشانی سے کہو۔ آپ کی بہت تعریف سنی تھی، مدت سے آرزو تھی۔ آپ سے شرف نیاز حاصل کیا جائے۔ خدا کا شکر ہے آج وہ مراد بر آئی''۔ اس نسخے پر عمل کرنے سے آپ کے دائرہ واقفیت میں اضافہ ہوگا اور لوگ آپ کو بہت نیک، حلیم اور ملن سار سمجھنے لگیں گے۔

حاجی صاحب نے دوسرا گر یہ بتایا، جب کوئی شخص آپ سے مشورہ طلب کرے تو یہ پتا چلانے کی کوشش کیجئے کہ وہ خود کیا چاہتا ہے؟ اس کے بعد اس کے فیصلہ کی زوردار الفاظ میں تائید کر دیجئے۔ مثال کے طور پر اگر وہ کہے کہ پروفیسری کے پیشے سے تنگ آ گیا ہے اور چاٹ کی دوکان کھولنا چاہتا ہے، تو فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہئے۔ جی ہاں۔ چاٹ کا دھندا بہت اچھا رہے گا۔ دو چار سال میں وارے نیارے ہو جائیں گے، لیکن اگر وہ دو ایک منٹ کے بعد اپنے نظریئے میں ترمیم کرتے ہوئے کہے، لیکن یہ کوئی معتبر پیشہ نہیں، تو آپ کے لیے یہ کہنا

واجب ہوگا۔ ہاں صاحب پروفیسری آخری پروفیسری ہے، کیا بات ہے اس پیشے کی! چاٹ بیچنے والوں کو ان کے سوا کون پوچھتا ہے"۔

"بہت خوب! حاجی صاحب واقعی بہت پہنچے ہوئے بزرگ معلوم ہوتے ہیں"۔

"جی ہاں! اس میں یا شک ہے۔ اسی طرح ایک اور پہنچے ہوئے بزرگ دیوان صاحب ہیں"۔

"ان سے آپ نے کیا سیکھا؟"

"بہت کچھ! ان کی تو ہر بات موتیوں میں تولنے کے قابل ہوتی ہے۔ مثلاً اسی کو، لیجئے وہ اپنے ہر تنگدست دوست سے وقت بے وقت روپیہ مستعار لینے کی درخواست کرتے رہتے ہیں"۔

"اس سے انہیں کیا فائدہ ہوتا ہے؟"۔

"یہ کہ کوئی تنگدست ان سے قرض مانگنے کے لیے نہیں آتا۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ دیوان بھی ہماری طرح تنگدست ہیں۔ اس طرح وہ مالی نقصان سے صاف بچ جاتے ہیں، جو ایک انسان کو اکثر اس لیے اٹھانا پڑتا ہے کہ اس کے دوست قرض لینے کے بعد واپس نہیں کرتے"۔

دیوان صاحب کا ایک اور بڑا سنہرا اصول یہ ہے کہ جب ان کا کوئی دوست یا رشتہ داران کے ہاں بطور مہمان آنے کا ارادہ کرتا ہے وہ اسے بواپسی ڈاک لکھ بھیجتے ہیں۔ "مجھے آپ کا خیر مقدم کر کے بہت مسرت ہوتی، لیکن افسوس انہی دنوں بمبئی جا رہا ہوں"۔ اگر اس حوصلہ شکن جواب کے باوجود کوئی ڈھیٹ مہمان ان کے یہاں آ دھمکتا ہے تو پھر وہ اسے بھگانے کے لیے دو تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ پہلی یہ کہ اس کی تواضع ایسے کھانے سے کرتے ہیں جس کی تاب صابر سے صابر مہمان دو دن سے زیادہ نہیں لا سکتا! اگر لنچ کے وقت اسے بینگن کی بھاجی، بینگن کے کوفتے، بینگن کا بھرتہ اور بینگن کا رائتہ پیش کیا جاتا ہے تو ڈنر کدو کی بھاجی، کدو کے کوفتے، کدو کا بھرتا اور کدو کے رائتے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس سلوک کے باوجود اگر وہ سخت جان ثابت ہو تو وہ اپنے ان سارے احباب کو مدعو کر لیتے ہیں جو پرلے درجے کے بور ہیں۔ انہیں مہمان کے پاس بٹھا کر خود کھسک جاتے ہیں وہ سب مہمان کا دماغ کچھ اس بے دردی سے چاٹنے لگتے ہیں کہ بے چارے کو وہاں سے بھاگے ہی بنتی ہے"۔

"دیوان صاحب واقعی کمال کے آدمی ہیں"۔

"آپ بجا فرماتے ہیں، لیکن مرزا صاحب بھی دیوان صاحب سے کس طرح کم نہیں"۔

''مرزا صاحب سے آپ نے کیا سیکھا؟''۔

''مرزا صاحب کا عقیدہ ہے، کسی شخص کی مدد کرنے سے پہلے یہ پوچھنا چاہیے میں اس کی مدد کروں تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ میں اس کی مدد نہ کروں تو مجھے کیا نقصان ہوگا؟ جواب دونوں حالتوں میں صفر ہو تو ہرگز مدد نہ کرنی چاہیے۔ مرزا صاحب ان اصولوں پر اتنی سختی سے عمل کرتے ہیں کہ آج تک انہوں نے کسی دوست کے جنازے کو کندھا نہ دیا۔ کسی یتیم کے آنسو نہ پونچھے۔ کسی بیوہ کی ڈھارس نہ بندھائی۔ صرف ایک بات انہیں یہ اصول توڑنا پڑا۔ جس کا انہیں عمر بھر افسوس رہے گا۔ ایک دن ان کے ہمسائے کے بچے کے حلق میں پانچ پیسے کا سکہ اٹک گیا اور اس کا دم گھٹنے لگا۔ ہمسائے نے انہیں ڈاکٹر کو ٹیلی فون کرنے کے لیے کہا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر سکہ حلق سے نکال لیا گیا، انہیں کچھ نہ ملے گا اور اگر دم گھٹنے سے بچے کی موت ہوگئی تو انہیں نقصان نہیں ہوگا۔ مرزا صاحب نے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کر دیا''۔

''یہ کہ'' کام حرام ہے کے مقولے پر عمل کرنا چاہیے'' لیکن اپنے افسر کو مرعوب کرنے کے لیے اپنی کارگزاری کا ہر وقت ڈھنڈورا پیٹتے رہنا چاہیے۔ کل صاحب میں دفتر سے سات بجے شام گھر گیا، پرسوں آٹھ بجے گیا تھا، گھر پر ایک بجے تک دفتر کا کام کرتا رہا۔ لیکن وہ ختم ہونے میں نہیں آتا ادھر آپ چاہتے ہیں کوئی فائل پینڈنگ نہ رہے۔ حضور اگر دو نہیں تو ایک اسسٹنٹ تو دلوا دیجیے، نہیں تو بخدا مر جاؤں گا''۔

''مرزا صاحب کے علاوہ آپ کے اور کتنے استاد ہیں؟''۔

''استاد تو کئی ہیں، لیکن صرف چیدہ چیدہ کا ذکر کروں گا۔ خان صاحب کو آپ جانتے ہی ہوں گے وہی جو رئیس اعظم کہلاتے ہیں۔ ان سے ہم نے بہت ہی کارآمد باتیں سیکھیں۔ مثلاً ایک بار انہوں نے فرمایا وہ شخص واقعی بہت سادہ لوح ہے جو دوسروں کو بے وقوف نہیں سمجھتا، ان کا مطلب تھا اپنی فضیلت قائم رکھنے کے لیے بڑے سے بڑے دانشمند کو خاطر میں نہ لانا چاہیے۔ اس میں دو ایک نقائص نکال کر ثابت کرنا چاہیے کہ اس جیسا جاہل انسان شاید ہی کوئی ہوگا۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں چاہے کوئی شخص کتنی ہی دور کی کوڑی لائے، اسے زچ کرنے کے لیے فوراً کہنا چاہیے۔ صاحب! یہ تو بہت فرسودہ بات ہے، آج سے پچیس سو برس پہلے افلاطون نے کہی تھی، اگر وہ بحث پر اتر آئے اور اعتراض کرے۔ افلاطون نے یہ بات ہرگز نہیں کہی۔ تو اسے بتانا

چاہیے سقراط یا ارسطو نے کہی ہوگی۔

ہمارے ایک اور استاد پنڈت جی ہیں۔ ان سے ہم نے چندہ مانگنے والوں کو ٹالنے کا گر سیکھا۔ ان سے جب کوئی شخص چندے کی درخواست کرتا ہے، وہ جھٹ معقول رقم دینے کا وعدہ کر لیتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ایک شرط بھی لگا دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ آپ کا نمبر آنے پر آپ کو چندہ ملے گا۔ اب آپ حشر تک انتظار کیے جائیے آپ کا نمبر نہ آئے گا۔ انہیں سے ہم نے کام نکالنے کا بھی آرٹ سیکھا۔ انہیں جب کسی شخص سے کام پڑتا ہے تو وہ اس کے داماد کو گھیر گھار کر اس کے پاس بھجوا دیتے ہیں اور جب تک اس سے ہاں نہیں کہلوا لیتے! داماد کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

یہاں ایک اور استاد کا ذکر بھی لازم ہے۔ آپ ہیں آغا صاحب۔ آپ تنقید نگار ہیں یا اپنے کو تنقید نگار سمجھتے ہیں۔ آپ کا اصول ہے کسی ادیب کی تعریف نہ کرنی چاہیے نہیں تو وہ خوامخواہ اکڑ جاتا ہے۔ جب کسی ادبی تخلیق غزل یا نظم پر ان کی رائے دریافت کی جاتی ہے تو منہ بنا کر کہتے ہیں۔ ہاں بری نہیں لیکن اگر شاعر اس کی نوک پلک سنوارنے کی مزید کوشش کرے تو بہتر ہو سکتی ہے۔ ایک بار کسی نے ان سے پوچھا۔ تاج محل کے متعلق کیا خیال ہے؟ فرمایا، اتنا خوبصورت تو نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ ہاں اگر شاہجہاں تھوڑی سی دماغ سوزی اور کر لیتا تو اس سے بہتر تاج محل کی تخلیق کر سکتا تھا۔ ایک مجلس میں دیوان غالب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ میری رائے میں اگر مرزا غالب اپنے منتخب کلام کا ایک بار اور انتخاب کرتے تو ان کا دیوان بہتر ہو سکتا تھا۔

آغا صاحب سمجھتے ہیں، شعراء کو ذلیل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ چاہے وہ کتنا زور ماریں ان سے کہا جائے۔ ع

''نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب!''

آپ نے ابھی تک چھ استادوں کا ذکر کیا۔ آپ کے استاد بھی تو ہوں گے؟''۔

''جی ہاں۔ وہ تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ان چھ کے ارشادات پر عمل کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کامیابی آپ کے قدم نہ چومے۔ باقی استادوں کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہ کہوں گا کہ میرے ایک استاد کا قول ہے کہ کچھ راز ایسے ہوتے ہیں جو کسی کو بتائے نہیں جا سکتے۔ اس لیے معذرت چاہتا ہوں''۔

☆☆☆

نسخہ

آزاد پارک میں ایک مجمع باز نے بہت بھیڑ اکٹھی کر رکھی تھی۔ وہ ایک اسٹول پر کھڑا تھا اور اس نے اپنے دائیں اور بائیں اگے ہوئے دو پودوں پر کچھ تصویریں لٹکا رکھی تھیں۔ مجمع سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میرے معزز دوستو! میں حکیم ہوں نہ مداری میں جادوگر بھی نہیں۔ میرے پاس گنجی چاند پر بال اگانے کا کوئی نسخہ نہیں۔ اصل میں اگر آدمی ایک بار گنجا ہو جائے اس کے سر پر کبھی بال نہیں اگتے۔ جیسے بنجر زمین میں گھاس نہیں اگتی۔ میں آپ کو جادو کا بھی کوئی کھیل نہیں دکھاؤں گا، کیونکہ جسے عرف عام میں جادو کہا جاتا ہے وہ محض ہاتھ کی صفائی ہے۔ جادوگر کا کمال ہے کہ وہ کامیابی کے ساتھ ناظرین کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے۔ میں کسی مداری کی طرح بڑے بوڑھوں کی ڈاڑھیوں میں سے انڈے برآمد نہیں کروں گا۔ میری رائے میں ایسا کرنا پرلے درجہ کی بدتمیزی ہے۔ میرے بیگ میں کالی کھانسی، تپ دق یا یرقان کی کوئی دوا نہیں۔ اگر آپ میں کوئی شخص ان نامراد امراض میں مبتلا ہے تو اسے کسی لائق ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کرنا چاہیے۔''

مجمع میں سے کسی شخص نے پوچھا۔ ''پھر تم پارک میں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ اتنا ہجوم کس لیے اکٹھا کر رکھا ہے؟''

مجمع باز نے جواب دیا۔ ''میں اس موضوع کی طرف آ رہا تھا۔ اچھا ہوا آپ نے خود مجھ سے یہ سوال کیا۔ معزز دوستو! میرے پاس ایک آزمودہ نسخہ ہے۔ یہ مجھے کسی سادھو' سنیاسی یا جوگی سے نہیں ملا۔ یہ میری اپنی ایجاد ہے۔ اس نسخے کا پرچار کرنے کے لیے میں ہر شہر میں وارد ہوتا ہوں، لیکن ایک گھنٹہ سے زیادہ نہیں ٹھہرتا، کیونکہ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور یہ دنیا بہت وسیع ہے۔ اس وقت پانچ بجے ہیں۔ چھ بجے میں آپ کے شہر سے چلا جاؤں گا اور پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ میرا جوگی والا پھیرا ہے''۔

کسی اور شخص نے دریافت کیا۔ ''آخر تمہارے پاس کس چیز کا نسخہ ہے؟''

مجمع باز بولا۔ ''میں اسی موضوع کی طرف ہی آ رہا تھا۔ معزز دوستو! کان کھول کر سن لیجیے میرے پاس لڑاکا اور جھگڑالو بیوی کو ٹھیک کرنے کا نسخہ ہے''۔ سب لوگ ہنسنے لگے۔ مجمع باز نے

نہایت سنجیدگی سے کہا ''آپ ہنس رہے ہیں۔ خدانخواستہ آپ کا واسطہ کسی بدمزاج، سڑیل اور بد زبان بیوی سے پڑ جائے تو پھر آپ خون کے آنسو روئیں گے۔ یہ دیکھئے میرے دائیں طرف ایک تصویر ٹنگی ہے۔ یہ ایک مشہور پروفیسر کی تصویر ہے۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ پچھلے دنوں اس نے خودکشی کر لی۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا ابھی ابھی بیاہ ہوا تھا۔ بدقسمتی سے اسے بڑی لڑاکا اور بدمزاج بیوی ملی۔ جس نے رات دن اس کی جان عذاب میں ڈال رکھی تھی۔ وہ زندگی سے تنگ آ گیا۔ اس نے سوچا ایسی زندگی سے موت بدرجہا اچھی ہے۔ معزز دوستو! حساب لگا کر دیکھا گیا ہے کہ سو میں سے اٹھاون شوہر اس لیے خودکشی کرتے ہیں۔ اب ذرا میرے دائیں طرف لٹکی ہوئی تصویر کو دیکھئے۔ یہ ایک خوبصورت نوجوان کی تصویر ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ستائیس برس کی عمر میں تپ دق میں مبتلا ہو گیا۔ وجہ؟ اس کی بیوی ہر روز اسے سخت سست کہا کرتی تھی۔ وہ ہر وقت دل میں کڑھتا رہتا تھا۔ آخر وہ بمبئی کے سول اسپتال میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرا۔ افسوس کتنا دردناک انجام ہوا اس نوجوان کا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ لڑاکا بیوی دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے''۔

مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ مجمع باز نے تیسری تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تصویر بنارس کے ایک سیٹھ کی ہے۔ آج کل وہ رانچی کے پاگل خانے میں ہے اور ہر وقت ''شنکتلا پر خدا کی لعنت..... شنکتلا پر خدا کی لعنت'' کی رٹ لگاتا ہے۔ شنکتلا اس کی بیوی کا نام ہے۔ معزز دوستو! کہتے ہیں، عشق نے ہزاروں گھر تباہ کئے۔ عشق تو یوں ہی بدنام ہے۔ عشق سے زیادہ گھر لڑاکا بیویوں نے تباہ کیے۔ انہوں نے تو نامور ادیبوں کو بھی معاف نہیں کیا۔ آپ نے روسی مصنف ٹالسٹائی کی بدمزاج بیوی کا قصہ ضرور سنا ہوگا۔ ٹالسٹائی اپنے ناول کا ایک باب مکمل کر رہا تھا کہ اتنے میں وہ چائے لائی اور چلا کر کہنے لگی۔ ''پہلے چائے پی لو، پھر لکھتے رہنا''۔ ٹالسٹائی پر انڈیل دی۔ بیچارے ٹالسٹائی نے پھر بھی مسکرا کر کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ بادل گرج رہا ہے ضرور برسے گا''۔ انگریز شاعر ڈرائیڈن کی بیوی اتنی بدزبان تھی کہ جب اس کی وفات ہوئی تو ڈرائیڈن نے اس کی قبر پر یہ الفاظ کندہ کرائے: ''یہاں مسز ڈرائیڈن آرام کر رہی ہے اور اس کی موت کے بعد اس کا شوہر بھی آرام کر رہا ہے''۔ میرے معزز دوستو! اگر آپ میں سے کسی بدنصیب کے پلے اس قسم کی بیوی پڑی ہے تو گھبرانے، شرمانے، پاگل ہونے یا خودکشی کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ صرف

ایک روپیہ صرف کر کے یہ نسخہ خرید سکتے ہیں۔ خیال فرمایئے ایک روپیہ کیا چیز ہے اس مسرت اور سکون کے مقابلے میں جو آپ کو اپنی لڑا کا بیوی کو راہ راست پر لا کر حاصل ہوگا۔ دیکھئے۔ جھینپنے کی ضرورت نہیں۔ گھر گھر یہی حال ہے۔ خوش مزاج بیوی تو اتفاق سے ملتی ہے۔ وہ اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ آپ نے غالب کا اپنی بیوی سے متعلق لطیفہ سنا ہوگا۔ اس کا نام امراؤ بیگم تھا۔ ایک دن وہ ایک نیا مکان دیکھنے گئی۔ غالب نے پوچھا۔ "پسند آیا نیا مکان؟" اس نے جواب دیا۔ "مکان تو اچھا ہے، لیکن سنا ہے اس میں ایک بلا رہتی ہے"۔ غالب نے تبصرہ کیا۔ "دنیا میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی بلا ہے؟" ہاں صاحب میں نسخے کا ذکر کر رہا تھا، جس شخص کو ضرورت ہو آواز دے کر خرید سکتا ہے۔ یہ نسخہ ایک لفافے میں بند ہے اسے گھر جا کر پڑھنا ہوگا، لیکن کسی شخص سے ذکر نہ کیجئے گا کہ اس میں کیا لکھا ہے ورنہ اس کا اثر زائل ہو جائے گا۔"

ایک نوجوان نے نسخہ خریدنے کے لیے ایک آواز دی۔ باقی لوگ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ مجمع باز نے کہا۔ "میں اس نوجوان کی اخلاقی ہمت کی داد دیتا ہوں۔ اس نے جھوٹی شرم کو بالائی طاق رکھتے ہوئے اپنی ازدواجی زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے نسخہ خریدا ہے۔ معزز دوستو! میں یہاں صرف پندرہ منٹ اور ٹھہروں گا۔ جسے نسخے کی ضرورت ہے فوراً خرید لے۔ پھر یہ نسخہ کسی قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہوگا۔

بیس پچیس اشخاص نے نسخہ خریدا۔ مجمع باز نے پودوں سے تصویریں اتاریں اور چلتا بنا۔

جس نوجوان نے سب سے پہلے نسخہ خریدا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر پہنچا تا کہ لفافہ کھول کر نسخہ پڑھے۔ لفافے میں ایک کاغذ کا پرزہ تھا جس پر لکھا تھا۔ "لڑا کا بیوی کو سیدھی راہ پر لانے کے لیے صرف تین ترکیبیں ہیں۔ پہلی: ہمیشہ کہئے جزاک اللہ، بجا فرمایا آپ نے..... اگر یہ گر کارگر ثابت نہ ہوا اور وہ بدزبانی پر اتر آئے تو آپ ایسی ایکٹنگ کیجئے جسے آپ پر بے ہوشی طاری ہوا چاہتی ہے۔ دو ایک منٹ کے بعد دھڑام سے فرش پر گر پڑیئے۔ جیسے واقعی آپ بے ہوش ہو گئے ہیں۔ اگر یہ ترکیب بھی بے کار ثابت ہو تو پھر چپکے سے گھر سے بھاگ جایئے اور اس وقت تک گھر واپس نہ آیئے جب تک کہ وہ اخباروں میں اعلان نہ کرے کہ اس نے بدزبانی اور بدمزاجی سے توبہ کر لی ہے اور آئندہ آپ کو تنگ نہیں کرے گی۔

☆☆☆

فتنہ بٹالوی

روایت ہے جب مرزا محمد رفیع سودا کسی شخص سے بگڑتے تو فوراً پکارتے۔ ''ارے غنچہ! لاتو قلمدان۔ ذرا اس کی خبر تو لوں۔ یہ مجھے سمجھا کیا ہے''۔ یہ اسی قلمدان کا نتیجہ تھا کہ عالم، جاہل، فقیر امیر، نیک، بدکسی کی عزت ان کے ہاتھ سے نہیں بچی، اس طرح پیچھے پڑتے تھے کہ انسان جان سے بیزار ہو جاتا تھا۔ معلم ہوتا ہے میاں غنچہ کے انتقال کے بعد یہ قلمدان جناب فتنہ بٹالوی کے ہاتھ لگ گیا۔ آپ ہجو تو نہیں کہتے، لیکن جہاں تک کسی کی خبر لینے کا سوال ہے۔ اکثر مرزا سودا سے بھی بازی لے جاتے ہیں۔ ادھر کس سے ناراض ہوئے، ادھر جھٹ اس کے خلاف ایک شکایتی خط لکھ کر اس کے افسر کو بھجوا دیا۔ اس کی جواب طلبی ہو گئی۔ اور یہ بغلیں بجا کر اترانے لگے۔ آپ بھی یاد کریں گے فتنہ بٹالوی سے پالا پڑا تھا۔

ایک دن فتنہ صاحب ریڈیو لائسنس بنوانے کے لیے ڈاکخانہ گئے۔ کلرک نے آپ سے قطار میں کھڑے ہونے کے لیے کہا۔ انہیں بہت ناگوار گزرا۔ اس وقت انہوں نے تو صبر سے کام لے کر کلرک کی بات مان لی، لیکن گھر آ کر پوسٹ ماسٹر جنرل کو ایک چٹھی لکھی جس میں کلرک مذکور کو پانی پی پی کر کوسا۔ یہ کلرک پرلے درجے کا کام چور ہے۔ وقت مقررہ کے دو گھنٹے بعد کھڑکی کھولتا ہے۔ عوام کے ساتھ بڑی بدتمیزی سے پیش آتا ہے۔ اس کی بد دماغی سے تنگ آ کر لوگوں نے لائسنس بنوانا بند کر دیئے ہیں۔

اس طرح گورنمنٹ کو ہزاروں روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ ایسے نااہل کلرک کو فوراً برخاست کر دینا چاہیے۔ اگر اسے برخاست نہیں کیا جا سکتا کم از کم معطل ضرور کر دینا چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے اسے معطل بھی نہیں کیا جا سکتا اسے سخت تنبیہ کی جانی چاہیے۔ وگرنہ عوام کو مجبور ہو کر اس کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھانا پڑے گا جس کے نتائج کی ذمہ داری گورنمنٹ پر ہو گی۔

افسر ان بالا نے جب اس کلرک سے بازپرس کی، وہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے فتنہ صاحب سے بڑی عاجزی کے ساتھ سوال کیا۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا جو آپ نے میرے خلاف شکایات کا طومار باندھ دیا۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''برخوردار! یہ جوابی حملہ ہے تمہیں شاید معلوم نہیں ہمارے قلم میں کتنی طاقت ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایم۔ نے ایک انسپکٹر پولیس

کو جو اپنے زعم میں کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا، معطل کرایا ہے۔ اور یہ تو تم جانتے ہی ہو گے تمہارے سابقہ پوسٹ ماسٹر کو یہاں سے تبدیل کرانے میں کس کا ہاتھ تھا۔ تمہاری تو اوقات ہی کیا ہے۔ ہم نے تو بڑے بڑے طرم خاں سیدھے کر دیئے۔"

ڈاکخانہ کے کلرک کی خبر لینے کے بعد فتنہ صاحب نے ایک بینک کے کلرک کو راہ راست پر لانے کا تہیہ کر لیا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اُس نے دو بجے کے بعد فتنہ صاحب کے اصرار کے باوجود ان کے لیے ایک ڈرافٹ تیار کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پہلے تو انہوں نے کلرک کو سخت سست کہا۔ تم خواہ مخواہ پبلک کو تنگ کرتے ہو۔ دو بجے کا وقت کوئی مہورت تو نہیں جس کے ٹل جانے پر ڈرافٹ تیار نہیں کیا جا سکتا۔ جب کلرک ان کی سرزنش سے مرعوب نہ ہوا، انہوں نے منیجر سے شکایت کی۔ اس نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ جل بھن کر آپ سیدھے تار گھر پہنچے اور بینک کے جنرل منیجر کو ایک تار بھجوایا۔ جس میں کلرک مذکور کے علاوہ منیجر کی شکایت کرتے ہوئے جنرل منیجر کو مداخلت کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد ایک مفصل خط میں انہوں نے انکشاف کیا کہ کلرک اور منیجر بے ایمان اور رشوت خور ہیں۔ جب تک ان کی مٹھی گرم نہ کی جائے کسی شخص کا کام نہیں کرتے۔ ڈرافٹ تیار کرنے کے لیے انہوں نے دس روپے طلب کئے۔ جب ہم نے انکار کیا، انہوں نے ہمیں بینک سے دھکے مار کر باہر نکال دیا۔ ان دونوں نے بینک میں عجیب دھاندلی مچا رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے بینک کی ساکھ گر رہی ہے۔ ان کے خلاف اگر کارروائی نہ کی گئی تو بینک فیل ہو جائے گا۔

جنرل منیجر نے کلرک اور منیجر سے جواب طلب کیا۔ جب انہوں نے اسے اصل ماجرہ سے آگاہ کیا، اس نے فتنہ صاحب کی شکایت داخل دفتر کر دی۔ فتنہ صاحب کو بہت قلق ہوا۔ انہوں نے جنرل منیجر کے خلاف ایک خط لکھ کر ایک مشہور روز نامہ میں چھپوانے کی لیے بھجوایا۔ ایڈیٹر نے اسے ایک فضول خط سمجھ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ اس کے اس سلوک سے فتنہ صاحب بہت برہم ہوئے۔ انہوں نے ایک ذاتی خط اخبار کے مالک کو لکھا..... آپ کا ایڈیٹر عقل اور تمیز سے عاری ہے۔ وہ نہایت فضول اور بے معنی ایڈیٹوریل لکھتا ہے۔ جب سے اسے ایڈیٹر مقرر کیا گیا ہے، اخبار کا معیار گر گیا ہے۔ کبھی آپ کے اخبار کی ہر دلعزیزی کا یہ حال تھا، اخبار بین کسی اور اخبار کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ اب یہ حالت ہے کوئی شخص اسے مفت پڑھنا بھی گوارا

نہیں کرتا۔ آپ کے اخبار کا مستقبل خطرے میں ہے۔ اگر آپ نے اس نالائق ایڈیٹر کو برخاست نہ کیا تو عنقریب آپ کو اخبار بند کرنا پڑے گا"۔

جب فتنہ صاحب کی یہاں بھی دال نہ گلی انہوں نے اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں انہوں نے اشاروں اور کنایوں سے کام لیتے ہوئے اخبار کے مالک اور ایڈیٹر کے خلاف خوب زہر اگلا۔ اس پمفلٹ کو لے کر وہ ہر ایک مجلس میں جاتے اور بڑے فخر کے ساتھ کہتے۔ "اگر ہم نے ان دونوں کو ساری دنیا میں ذلیل و خوار نہ کیا ہمارا نام فتنہ بٹالوی نہیں۔ آخر انہوں نے ہمیں سمجھا کیا ہے"۔

گذشتہ ماہ فتنہ صاحب کے لڑکے کا جو کہ مقامی کالج میں پڑھتا ہے، داخلہ روک لیا گیا، وہ انگریزی اور حساب کے مضامین میں فیل تھا۔ فتنہ صاحب نے پروفیسروں سے اس کے نمبر بڑھانے کے لیے کہا۔ جب انہوں نے انکار کیا ان کے خلاف ایک عرضی پرنسپل صاحب کو لکھ دی، جس میں ان پر الزام لگاتے ہوئے لکھا، ہمیں معتبر ذریعہ سے پتہ چلا ہے کہ انہوں نے دس روپے فی نمبر کے حساب سے فیل شدہ طلباء کے نمبر بڑھائے ہیں۔ یہ ان طلباء کی ناجائز مدد کرتے ہیں جو ان کے پاس ٹیوشن پڑھتے ہیں۔ ان کے خلاف ایکشن لیا جانا چاہیے۔ ان کی وجہ سے کالج بدنام ہو رہا ہے۔

پرنسپل نے ان پروفیسروں کے خلاف انکوائری کرنے کے بعد فتنہ صاحب کو مطلع کیا کہ ان کے الزامات میں کوئی صداقت نہیں۔ فتنہ صاحب یہ بات کب ماننے والے تھے۔ انہوں نے پرنسپل صاحب کے خلاف ایک خط مینجنگ کمیٹی کے صدر کو لکھا۔ "جب سے اس شخص نے کالج کا چارج لیا ہے، کالج تنزل کی طرف جا رہا ہے۔ یہ اچھا استاد ہے نہ منتظم۔ اس کا اپنے اسٹاف اور طلبہ پر کوئی کنٹرول نہیں۔ یہ ضرورت سے زیادہ آرام طلب ہے۔ دفتر میں لیٹ آتا ہے اکثر بیمار رہتا ہے۔ اگر یہ چند سال اور پرنسپل رہا تو کالج تباہ ہو جائے گا"۔ جب مینجنگ کمیٹی نے اس خط کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ فتنہ صاحب نے مینجنگ کمیٹی کی شکایت کرتے ہوئے یونیورسٹی کو لکھا۔ یہ نااہلوں اور نامعقولوں کی کمیٹی ہے۔ اسے برخواست کر کے یونیورسٹی کوئی کمیٹی نامزد کرنا چاہیے ورنہ اس کالج کا خدا حافظ ہے۔

فتنہ صاحب سے ہر شخص پناہ مانگتا ہے۔ اکثر فخریہ لہجہ میں فرمایا کرتے ہیں اب تو محلے میں

عورتیں اپنی بچوں کو خاموش کرانے کے لیے کہتی ہیں۔ چپ ہو جاؤ نہیں تو فتنہ صاحب تمہارے خلاف بھی ایک خط لکھ دیں گے۔ یہ بھی کہا کرتے ہیں۔ میر نے یہ شعر ہمارے لیے کہا تھا۔

اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میر تم کو
الجھاؤ ہے زمین سے، جھگڑا ہے آسماں سے

ان کا عقیدہ ہے اپنے سوا ہر شخص کو قابل مذمت سمجھانا چاہیے۔ نیز آئے دن ایک نہ ایک فتنہ برپا کرتے رہنا چاہیے۔ آخر کوئی فتنہ تو رنگ لائے گا۔ نہ بھی لائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کم از کم لوگ آپ کے وجد کو نظر انداز تو نہ کر سکیں گے!

☆☆☆

شکوہ صاحب

ایک عام آدمی اپنے گھر کو گھر اور دفتر کو دفتر سمجھتا ہے، لیکن کچھ خدا کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو گھر کو بھی دفتر سمجھتے ہیں۔ انہی میں سے ہمارے ایک دوست اور پڑوسی شکوہ صاحب بھی ہیں۔ عمر پچاس سال، بدن اکہرا، سر کے بال کھچڑی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور مونچھیں۔ شکوہ صاحب کو دیکھ کر کسی سرکس کے جوکر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، حالانکہ وہ جوکر نہیں، ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں کلرک ہیں۔ وہ جب دفتر سے گھر لوٹتے ہیں نہ صرف فائیلوں سے لدے پھندے ہوتے ہیں، دفتر کا ماحول بھی ان کے ہم رکاب ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر گھریلو گفتگو میں بھی دفتری اصطلاحیں استعمال کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً بیگم پوچھتی ہیں۔ ہم نے نئی ساڑھی کی فرمائش کی تھی، اس کا کیا ہوا۔ وہ کہتے ہیں آپ کی فرمائش ''زیر غور'' ہے۔ مناسب وقت آنے پر اس پر کارروائی کی جائے گی۔ منے نے جیب خرچ میں اضافہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ ''منے کی درخواست داخل دفتر کر دی گئی ہے۔ بجٹ میں گنجائش نہیں''۔

شکوہ صاحب کو اپنے دفتر کے علاوہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں۔ تاش اور شطرنج سے انہیں نفرت ہے۔ مطالعہ کو وہ تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ سینما اس لیے نہیں دیکھتے کہ ان کی بینائی کمزور ہے۔ نیز کچھ اونچا بھی سنتے ہیں۔ لے دے کے ایک دفتر ہے جو ہمیشہ ان کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ بقول غالب

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

ان سے کسی موضوع پر بات کی جائے، وہ اس کا رخ دفتر کی طرف پھیر دیتے ہیں اور پھر گویا شکایتوں کا دفتر کھل جاتا ہے۔ سب سے زیادہ رونا وہ اپنے سپرنٹنڈنٹ کا روتے ہیں۔ ''صاحب! عجیب وحشی سے پالا پڑا ہے۔ بات بات پر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ ذرا سی لغزش ہو جائے، پیچھے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتا ہے۔ پرسوں ہم دفتر میں ذرا دیر سے پہنچے۔ راستے میں آغا صاحب مل گئے تھے۔ خیر و عافیت پوچھنے کے لیے دو ایک منٹ ٹھہر گئے۔ جونہی اپنے کمرے میں قدم رکھا، چپراسی نے مطلع کیا۔ صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ جل تو جلال تو آئی بلا ٹال تو کا وظیفہ پڑھتے ہوئے ان کے آفس میں داخل ہوئے۔ انہوں نے گرج کر کہا۔ ''آپ ہمیشہ دفتر میں لیٹ آتے ہیں۔ وجہ بیان کیجئے۔ آپ کے خلاف کیوں ایکشن نہ لیا جائے''۔ ہم نے بڑے انکسار کے ساتھ عرض کی۔ ''جناب آج پانچ منٹ لیٹ ہو گئے۔ ورنہ ہمیشہ دس منٹ پہلے آیا کرتے ہیں''۔ وہ میز پر مکا مارتے ہوئے بولے۔ ''جھوٹ سفید جھوٹ ہم دو ہفتوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ ہر روز لیٹ آتے ہیں۔ دیر سے آنا آپ کی عادت بن چکی ہے''۔ جی میں آیا ان سے کہیں..... ''خواہ مخواہ ماتحتوں کو تنگ کرنا آپ کا شیوہ بن گیا ہے''۔ لیکن مصلحت کا تقاضا تھا کہ چپ رہیں۔ انہوں نے اپنا نادر شاہی فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ آئندہ لیٹ آئے تو اس دن کی تنخواہ کاٹ لی جائے گی''۔

ہم لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اپنے کمرے میں آئے۔ ابھی انہیں دل ہی دل میں اچھی طرح کوس بھی نہیں سکے تھے کہ ان کا بلاوا پھر آیا۔ ڈرتے ڈرتے حاضر ہوئے۔ انہوں نے ایک کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ان رقموں کی میزان آپ نے لگائی ہے''؟

''جی ہاں''۔

''اس میں پندرہ پیسوں کی غلطی ہے''۔

''جلدی میں ہو گئی ہو گی''۔

''کیا مطلب۔ آپ سوچ سمجھ کر میزان نہیں لگاتے''۔

''کبھی کبھار احتیاط کے باوجود غلطی ہو جاتی ہے''۔

''یہ اچھی احتیاط ہے۔ایک نہ دو پورے پندرہ پیسوں کی غلطی''۔

''لائیے۔اسے ٹھیک کر دیتے ہیں''۔

''اگر پڑتال کیے بغیر ہم نے بھی دستخط کر دیئے ہوتے اور افسران بالا کی نگاہ اس پر پڑ جاتی تو.....''۔

''معمولی غلطی ہے۔ہمارا تو خیال ہے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا جاتا''۔

''آپ کے نزدیک ہر غلطی معمولی ہوا کرتی ہے۔گذشتہ ماہ بھی آپ کی میزان میں ایک غلطی نکلی تھی۔یاد ہے آپ کو؟''۔

''وہ تو صرف تین پیسوں کی غلطی تھی''۔

''غلطی آخر غلطی ہے۔تین کی ہو یا تیس پیسوں کی۔آئندہ ذرا ہوش سے میزان لگایا کیجئے۔نہیں تو سخت نوٹس لیا جائے گا؟''۔

اس دوسری سرزنش نے ہمیں بالکل جھنجھور کر رکھ دیا۔ہم سوچنے لگے یہ افسر ہے یا قصائی۔اگر ہفتہ عشرہ میں میزان کی ایک غلطی نکل آئی تو کون ساغضب ہو گیا۔آخر کلرک کوئی کمپیوٹر تو نہیں ہوتا کہ اس سے کبھی غلطی سرزد نہ ہو۔

ہم شکوہ صاحب سے رسمی ہمدردی جتاتے ہوئے کہتے ہیں۔چھوڑیئے شکوہ صاحب، دفتروں میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔وہ سپرنٹنڈنٹ کو چھوڑ کر ہمارے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔''آپ کی رائے میں یہ معمولی باتیں ہوتی ہیں۔آپ کا اس قماش کے افسر سے کبھی واسطہ نہیں پڑا،اس لیے آپ اس کی طرف داری کر رہے ہیں''۔

''ہم اس کی طرفداری کر رہے۔آپ سے صرف موضوع بدلنے کے لیے کہہ رہے ہیں''۔

''آپ موضوع بدلنا چاہتے ہیں تو لیجئے۔ہمارے دفتر میں دو کلرک ہیں''۔

''پھر وہی دفتر کی بات''۔

''دیکھئے صاحب۔ہم نے موضوع بدل دیا ہے۔اب آپ کو یہ قصہ سننا ہی پڑے گا''۔

''اچھا سنائیے''۔ہم بادل ناخواستہ کہتے ہیں۔

''صاحب!یہ دونوں کلرک آفت کے پرکالے ہیں۔شیطان بھی ان سے پناہ مانگتا ہے۔ان میں سے ایک تو سپرنٹنڈنٹ کا رشتہ دار ہے،دوسرا اس کا چچہ ہے۔انہوں نے سازش کر رکھی ہے کہ ہمیں ذلیل و خوار کر کے ہی دم لیں گے۔ہر وقت صاحب کے کان بھرتے رہتے

ہیں۔شکوہ صاحب دفتر کی اسٹیشنری چرا کر گھر لے جاتے ہیں۔شکوہ صاحب وقت سے پہلے گھر چلے جاتے ہیں۔پچھلے دنوں تو انہوں نے حد ہی کر دی۔وہ قسمت ہی اچھی تھی ورنہ ہمارے برطرف کیے جانے میں تھوڑی ہی کسر رہ گئی تھی۔آپ سن رہے ہیں نا؟ اونگھ تو نہیں رہے''۔

''جی ہاں۔جی ہاں۔بڑے شوق سے سن رہا ہوں''۔

''ایک دن ہم نے صاحب کی ٹائپسٹ سے ہلکا سا مذاق کیا۔اس کی بھنک انہیں پڑ گئی وہ فوراً اس خاتون کے پاس پہنچے اور اسے بہکایا کہ وہ ہمارے خلاف شکایت لکھ کر صاحب کو دے۔جب اس نے آنا کانی کی اسے دھمکانے لگے۔مجبور ہو کر اس نے ان کی بات مان لی۔ہمارے صاحب کو ایسا موقع خدا دے۔انہوں نے ہم پر لگائے گئے الزام کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے ہمیں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کہا۔ہم بہت گھبرائے۔اس خاتون کے گھر پہنچے۔بیوی بچوں کا واسطہ دیا۔بڑی مشکل سے اس خدا کی بندی کو اپنی شکایت واپس لینے پر راضی کیا۔اس کے باوجود صاحب نے ہمیں تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔آئندہ محتاط رہنے۔نہیں تو آپ کو برخاست کر دیا جائے گا۔تو ملاحظہ کی آپ نے ان شیطانوں کی کارستانی''۔

''اچھا شکوہ صاحب۔اب دفتر کی کافی باتیں کر چکے۔اب کوئی اور بات کیجئے۔دیکھئے موسم کتنا خوش گوار ہو گیا ہے''۔

''خاک خوش گوار ہو گیا ہے۔جس کمرے میں ہم کام کرتے ہیں وہاں اتنی سردی ہوتی ہے کہ ہاتھ پیر سن ہو جاتے ہیں۔کئی بار صاحب سے کہہ چکے ہیں کہ ایک ''ہیٹر'' کی منظوری دے دیجئے۔وہ فرماتے ہیں کہ ''ہیٹر'' افسروں کے لیے ہوتے ہیں۔کلرکوں کے لیے نہیں۔ہیٹر کی بات چھوڑیئے۔پچھلے دو سال سے کہہ رہے ہیں،دو کرسیاں خریدنے کی اجازت دی جائے،لیکن وہ نہیں مانتے''۔

ہم شکوہ صاحب کا دھیان دفتر سے ہٹانے کے لیے کہتے ہیں۔'شکوہ صاحب ہمارے ملک نے آزادی کے بعد کافی ترقی کی ہے،آپ کا کیا خیال ہے''؟

وہ نہایت بے دلی کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔''صاحب۔آپ کہتے ہیں تو ملک نے ضرور ترقی کی ہوگی،لیکن ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ہماری سالانہ ترقی تو تین سال سے رکی ہوئی ہے۔کئی بار لکھ چکے ہیں،کوئی شنوائی نہیں ہوتی''۔

یہ سمجھتے ہوئے کہ تیر خطا ہوا، ہم اس بار ریس کے گھوڑوں کا ذکر کرتے ہیں۔ شکوہ صاحب اس مضمون سے ایک نیا پہلو نکال لیتے ہیں۔ ''اجی صاحب آج کل گدھا گھوڑا ایک بھاؤ ہے۔ شرما صاحب الیف۔ اے پاس ہیں۔ ہم بی۔ اے ہیں، لیکن ہم دونوں کو ایک ہی گریڈ دیا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے اس سے پہلے جو سپرنٹنڈنٹ ہوا کرتے تھے، ہمارے قدر دان تھے، لیکن اب تو گھوڑے گئے گدھوں کا راج آیا''۔

ان کی گفتگو کی تاب نہ لا کر ہم اٹھتے ہوئے کہتے ہیں ''اچھا شکوہ صاحب اجازت دیجئے پھر کبھی حاضر ہوں گے''۔ کہنے کو تو ہم کہتے ہیں پھر کبھی آئیں گے، لیکن سوچتے ہیں جب بھی شکوہ صاحب سے ملاقات ہوگی وہ دفتر کا قصہ چھیڑ دیں گے اور حسب معمول بھول جائیں گے یہ گھر ہے دفتر نہیں اور جب ہم اس سے عرض کریں گے۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

تو وہ اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے فرمائیں گے۔

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

☆☆☆

چچا سلیمان

نام تو ان کا کچھ اور ہے، لیکن ہم سب انہیں چچا سلیمان کہتے ہیں۔ چہرہ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح سرخ۔ آنکھوں میں غضب کی چمک۔ بڑی بڑی مونچھیں جو بعض اوقات مصنوعی معلوم ہوتی ہیں اور مصنوعی دانت جن پر قدرتی ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ چچا سلیمان بڑی بارعب شخصیت کے مالک ہیں۔ حفیظ جالندھری کے برعکس جن کا تجربہ تھا زندگی میں پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں، ان کا تجربہ ہے زندگی میں تجربے ہی تجربے ہیں۔ اکثر فرمایا کرتے ہیں۔ وہ کون سا تجربہ ہے جس سے ہم دوچار نہیں ہوئے۔ بہتر برس کی عمر میں کیا کیا نہیں دیکھا۔ طوطا چشم احباب دیکھے، بدمزاج ہمسایوں سے پالا پڑا۔ زود رنج بیوی اور لاڈلے بچوں کے ناز اٹھائے، طرح

طرح کے امراض میں مبتلا ہوئے۔ رسالہ نکالا، شاعری کرتے رہے، ملازمت اختیار کی، معطل ہوئے، بحال کر دیے گئے۔ پینشن پائی۔ الغرض کس کس سانحے کا ذکر کیا جائے۔

ان کا مرغوب ترین شغل نوجوانوں کو اپنے تجربات سے آگاہ کرنا ہے۔ ان کا تکیہ کلام ہے۔ ''عزیزو! تجربہ بڑی چیز ہے۔ ہماری باتیں پلے باندھ لو۔ وگرنہ زندگی وہ پٹخنی دے گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا''۔

ایک دن وہ برآمدے میں کھڑے تھے۔ ہم ان سے آنکھیں چرا کر کھسکنا چاہتے تھے کہ انہوں نے دیکھ لیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا'' پکڑے گئے نا؟ ہم آداب بجا لائے۔ بڑی شفقت کے ساتھ پیش آئے۔ ڈرائنگ روم میں لے جا کر چا کو لیٹ کھلائے۔ اس کے بعد حال چال پوچھا۔ ہم نے انہیں بتایا، اگلے اتوار کو ایک ٹرپ کے ساتھ آگرہ جا رہے ہیں۔ چچا کی آنکھوں میں یک لخت ایک چمک نمودار ہوئی۔ فرمایا برخوردار! آگرہ ضرور جاؤ لیکن تاج محل مت دیکھنا، نہیں تو تمہیں سخت مایوسی ہوگی''۔

ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔''وہ کیوں؟''۔

''ہمارا تجربہ ہے، تاج محل اتنا خوبصورت نہیں جتنا اسے سمجھا جاتا ہے۔ دراصل کوئی چیز اتنی دل کش نہیں ہوتی جتنا کہ اس کا تصور ہوتا ہے''۔

انہوں نے سگریٹ سلگایا اور دو ایک کش لگانے کے بعد بولے۔''دیکھو عزیز، تمہیں ایک تجربے کی بات بتاتے ہیں۔ زندگی میں کبھی ایسے تانگے میں سوار مت ہونا جس کا کوچوان کانا اور گھوڑا اسٹنگر اہو، سوار ہونے سے پہلے ان دونوں باتوں کی تصدیق کر لینا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے''۔

اس کے بعد انہوں نے اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کیا۔ آج سے چالیس برس پہلے انہیں کسی ضروری کام سے دہلی جانا پڑا۔ جب اسٹیشن سے باہر آئے ایک ایسے تانگے میں سوار ہو گئے جس کا کوچوان کانا اور گھوڑا اسٹنگر اتھا۔ اس تانگے کا ایک بیل گاڑی سے تصادم ہو گیا۔ چچا بری طرح زخمی ہو گئے اور پندرہ دن اسپتال میں رہے۔

ہم نے ان کی دور اندیشی کی داد دیتے ہوئے پوچھا۔''ٹیکسی کے متعلق کیا خیال ہے؟''''خوب یاد دلایا'' انہوں نے کرسی سے اچھلتے ہوئے کہا۔..... ''کسی ایسی ٹیکسی میں سوار نہیں ہونا چاہیے، جس کا ڈرائیور سیاہ فام ہو، جس کی ایک آنکھ بیٹھی ہوئی ہو اور جس نے

نیلے رنگ کی قمیص پہن رکھی ہو۔ عموماً ایسا ڈرائیور ڈاکو ہوتا ہے۔ کانپور میں ہمارا واسطہ ایسے ہی ڈرائیور سے پڑا تھا۔ وہ ہمیں ایک ایسی سنسان جگہ لے گیا، جہاں ہم دونوں تھے یا خدا کی ذات تھی۔ وہاں ظالم نے پستول دکھا کر ساری نقدی چھین لی اور ہمیں سڑک کے کنارے چھوڑ کر فو چکر ہو گیا''۔

''اچھا اب اجازت دیجئے''۔ ہم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے بھائی بیٹھو۔ ایسی کون سی جلدی ہے۔ تمہیں دو ایک تجربات سے روشناس کرائیں''۔

ہمیں بادل ناخواستہ بیٹھنا پڑا۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولے۔ ''کیا زمانہ تھا وہ بھی ہم اس وقت جوان تھے۔ ایک دفعہ گڑھوال کی پہاڑیوں پر شیر کا شکار کرنے گئے۔ ایک درخت پر مچان بنایا۔ درخت کے نیچے ایک بکرا کھونٹے سے باندھ دیا۔ آدھی رات کے بعد ہمیں شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی۔ ہمیں محسوس ہوا وہ بکرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم نے رائفل سے دو فائر کیے۔ شیر زور سے دھاڑا اچھلا اور زمین پر گر پڑا، ہم بہت خوش ہوئے، لیکن جب ٹارچ کی روشنی میں نیچے کی طرف دیکھا شیر کا نام ونشان نہ تھا۔ البتہ بکرا گولیوں کی تاب نہ لا کر دم توڑ رہا تھا''۔

''برخوردار! ایسی غلطی کئی شکاریوں سے ہو جاتی ہے۔ دراصل وہ مچان پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتے ہیں۔ خواب میں انہیں شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ خواب سے بیدار ہو کر وہ اس پر فائر کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے وہ جانور جو انہوں نے شیر کو مچان کے قریب لانے کے لیے کھونٹے سے باندھا تھا، مارا جاتا ہے۔ شیر کا شکار کرتے وقت یہ احتیاط ضروری ہے کہ شکاری چوکنا رہے، کیونکہ اصلی اور خواب میں دیکھے گئے شیر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ویسے ہمارا خیال ہے شیر کا شکار کرنا ہی نہیں چاہیے۔ شیر فطرتاً ایک شریف جانور ہے۔ بھیڑیے اور چیتے سفاک واقع ہوئے ہیں۔ شیر کا شکار کرنے کے بعد ہمیشہ افسوس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے، ہم نے ایک درویش کو قتل کر دیا''۔

''بہت خوب''۔ ہم نے ان کے آخری فقرے کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے ہماری پیٹھ ٹھونکی اور بولے۔ ''اچھا برخوردار چلتے چلتے تمہیں دو نہایت کارآمد نکتے بتا دیں۔ پہلا یہ کہ کبھی اخبار کا مطالعہ نہیں کرنا چاہیے..... دوسرا یہ کہ ایسے مقرر کی بات پر ایمان نہیں لانا چاہیے، جو

یہ کہے کہ صرف دو منٹ کے لیے سامعین سے خطاب کرنا چاہتا ہے"۔

"وجہ؟" ہم نے پوچھا۔

"اخبار میں جو خبریں دل چسپ ہوتی ہیں، جھوٹی ہوتی ہیں اور جو سچی ہوتی ہیں غیر دل چسپ ہوتی ہیں۔ عموماً اخبارات میں دردناک سانحوں کا ذکر ہوتا ہے۔ اس بات کا رونا ہوتا ہے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس قسم کی پیشین گوئیاں ہوتی ہیں، قحط پڑنے والا ہے، جنگ چھڑنے والی ہے۔ ایسی خبریں پڑھ کر قاری حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ اب رہا اداریہ۔ اس سے زیادہ خشک اور اکتا دینے والا صفحہ شاید ہی اخبار میں ہوتا ہوگا۔ ہمارا تجربہ ہے اگر اخبار پڑھنا ہی پڑے، صرف اشتہارات پڑھنے چاہئیں۔ یہ کافی دل چسپ اور جاذب نظر ہوتے ہیں۔ ہر ایک اشتہار میں کوئی کافر ادا حسینہ قارئین کو دعوت نظارہ دیتے ہوئے کسی خاص چیز کو خریدنے کی سفارش کرتی ہے جسے وہ کبھی نہیں خریدتے۔ کیونکہ اشتہار پڑھنے کے بعد انہیں حسینہ یاد رہتی ہے اور جس چیز کو خریدنے کی اس نے سفارش کی تھی، بھول جاتی ہے"۔

"آپ نے مقرر کے متعلق بھی کچھ فرمایا تھا"۔

"یاد رکھو جو مقرر تمہید کے طور پر کہتا ہے دو منٹ کے لیے تقریر کرنا چاہتا ہوں۔ اول درجے کا جھوٹا ہے۔ دو منٹ میں دو چار نعرے لگائے جا سکتے ہیں۔ تقریر نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے جونہی وہ یہ الفاظ زبان پر لائے، مجلس سے اٹھ کر گھر کا راستہ لینا چاہیے۔ بصورت دیگر وہ تمہیں دو گھنٹے "بور" کرے گا اور جب اس کی تقریر ختم ہوگی، تم سوچو گے خدا جانے اس شخص کے پاس جو گھڑی ہے، وہ اس نے کون سی فرم سے خریدی ہے کہ اس کا ایک منٹ دوسری گھڑیوں کے ایک گھنٹے کے برابر ہوتا ہے"۔

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور نئے نئے تجربوں سے لدے پھندے گھر لوٹے۔

جب کسی تقریب کے سلسلے میں خاندان کے افراد اکٹھے ہوتے ہیں، اس وقت چچا سلیمان کی طبیعت رنگ پر آتی ہے، وہ کسی نہ کسی طرح اس جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں نوجوانوں نے محفل جما رکھی ہے۔ دو ایک منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد آمدم برسر مطلب والا معاملہ شروع ہو جاتا ہے۔ نوجوان انہیں چھیڑنے کے لیے عجیب و غریب سوالات کرنے لگتے ہیں۔ وہ ان

کے جوابات کچھ اس انداز سے دیتے ہیں کہ ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں۔اس وقت ان کی حیثیت اس سیاست دان کی ہوتی جس نے اپنی پریس کانفرنس میں صرف شوخ اور بے باک نامہ نگاروں کو مدعو کیا ہو۔ایک نوجوان پوچھتا ہے.....

''آپ کے خیال میں کس قسم کی لڑکی سے شادی کرنا چاہیے؟''۔

وہ اس کے گال پر ہلکی سی چپت رسید کرنے کے بعد کہتے ہیں۔تم بہت شریر ہو گئے ہو۔بڑے اوٹ پٹانگ سوال کرتے ہو''۔

پھر بھی اس معاملے میں آپ کا تجربہ کیا ہے؟

''ہمارا تجربہ ہے کہ ہر ایک لڑکی میں ایک نہ ایک عیب ضرور ہوتا ہے۔کوئی حسین ہے،لیکن ذہین نہیں۔کوئی حسین اور ذہین ہے،لیکن باتمیز و باسلیقہ نہیں۔کسی کی آنکھیں خوبصورت ہیں، لیکن ناک موٹی ہے۔کسی کی ناک ستواں ہے لیکن لب نازک نہیں،اس لیے ہمارا عقیدہ ہے کہ جس قسم کی بھی لڑکی مل جائے اس سے شادی کر لینا چاہیے''۔

ایک اور نوجوان لقمہ دیتے ہوئے کہتا ہے''آپ کا مطلب ہے چاہے وہ بہری،گنجی یا کانی ہو''۔

''برخوردار''وہ اپنی بیان کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔''بہری بیوی تو ایک نعمت ہے۔اسے کتنا سخت سست کہہ لو وہ ناراض نہیں ہوتی،کیونکہ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا۔گنجی بیوی کے لیے آپ مصنوعی بال خرید سکتے ہیں اور کانی بیوی تو ظاہر ہے سب خاندان کے افراد کو ایک آنکھ سے دیکھے گی،اس لیے اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔لڑکی پسند کرتے وقت صرف ایک چیز کا خیال رکھنا چاہیے،یعنی اس کی زبان ماپ لینا چاہیے۔اگر وہ گز بھر کی ہے تو چاہے لڑکی حسین ماہ جبین ہے،اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے،نہایت تعلیم یافتہ ہے،اسے دور ہی سے سلام کرنے میں خیریت ہے''۔

اب ان سے سوال کیا جاتا ہے۔محبت کے متعلق آپ کا کیا تجربہ ہے؟وہ سنجیدگی کے جملہ آثار اپنے چہرے پر طاری کرتے ہوئے فرماتے ہیں''کسی خاص خاتون کو باقی سب خواتین پر ترجیح دینے کا نام محبت ہے۔اصل میں محبت ایک نہایت غیر جمہوری فعل ہے۔کیونکہ جمہوریت میں تمام عورتوں کے حقوق مساوی ہوتے ہیں۔محبت،ہوس یا جنسی تشنگی کا ایک شاعرانہ نام ہے۔

یہی وجہ ہے شعراء اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ عام طور پر فرضی محبوبوں سے محبت کرتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے، کیونکہ ان میں سے بیشتر اتنے بدشکل ہوتے ہیں کہ بدصورت سے بدصورت عورت بھی ان سے پناہ مانگتی ہے''۔

''بیویوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟'' کوئی منچلا سوال کرتا ہے۔

''بھی کہاں میاں انہیں تو بھگوڑے کہو۔ یہ لوگ زندگی سے بھاگ کر زندگی میں ہی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ یہ خدا کے بندے بھول جاتے ہیں کہ اپنے ملک سے ہجرت کر کے کسی دوسرے ملک میں سکون دل کی تلاش کرنا بے سود ہے، کیونکہ زندگی تو ہر جگہ وہی ہے۔ ہمیں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک شاعر دہلی میں تنگدست رہنے لگا۔ ایک دن اس نے حیدر آباد جانے کا قصد کیا۔ وہ اپنے استاد کو الوداع کہنے کے لیے اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ استاد کو جب پتا چلا وہ جا رہا ہے اس نے کہا ''میاں! حیدر آباد کے خدا کو ہمارا سلام کہہ دینا''۔ شاگرد نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیا حیدر آباد کا خدا کوئی اور ہے''۔ استاد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''اگر اور نہ ہوتا تو دہلی چھوڑ کر حیدر آباد کیوں جاتے''۔

سیاست سے شغف رکھنے والا ایک نوجوان پوچھتا ہے۔ ''جمہوریت کے متعلق آپ کا کیا تجربہ ہے؟'' چچا سلیمان جواب میں کہتے ہیں ''تم نے نہایت معقول سوال کیا ہے۔ ہمارا تجربہ ہے، جمہوریت میں زبان قینچی کی طرح چلنے لگتی ہے، مگر دماغ سوچنا بند کر دیتا ہے۔ جمہوریت کو اس لیے پسند کیا جاتا ہے کیونکہ عوام گفتار کو کردار پر ترجیح دیتے ہیں۔ جمہوریت تب تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ہر ایک شخص یہ اعتراف نہیں کرتا کہ اس کا ہمسایہ نہیں وہ خود پاجی ہے۔ ہمارا تو یہ بھی تجربہ ہے جب تک انسان لومڑ اور بھیڑیے کی خصلتیں ترک نہیں کرتا کوئی طرز حکومت کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے''۔

جو نظام دل نہ بدل سکا تو نظام دہر کا کیا گلہ
وہی لذتیں ہیں گناہ میں وہی تلخیاں ہیں ثواب میں

چچا سلیمان کی پریس کانفرنس، مجلس وعظ کی طرح تا دیر چلتی رہتی ہے۔ ادھر بے چارہ میزبان فریاد کرتا رہتا ہے کہ لنچ کو دیر ہو رہی ہے، لیکن جب چچا سلیمان اور نوجوان ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں تو پھر لنچ کی کون پروا کرتا ہے!

☆☆☆

آخری الفاظ

عظیم راہ نما کوکا کولا، پی رہے تھے کہ یک لخت ان پر فالج گرا اور اس سے پہلے کہ وہ پکار کر کہتے..... بوتل کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں..... وہ چل بسے۔ ان کے انتقال پر ہر شخص نے اطمینان کا سانس لیا، کیونکہ مرحوم اپنے آخری دنوں میں بہکی بہکی باتیں کرنے لگے تھے۔ جنہیں سن کر داغ کا یہ مصرع پڑھنے کو جی چاہتا تھا..... وہ اس جینے سے مر جائے تو اچھا!

مرحوم کی وفات پانے کی مسرت سب سے زیادہ اس جوتشی کو ہوئی جو ہر سال ان کے مرنے کی پیشین گوئیاں کیا کرتا تھا اور جس نے تنگ آ کر یہ اعلان کیا تھا۔ اگر عظیم راہ نما فلاں تاریخ تک اللہ کو پیارے نہ ہوئے تو میں خودکشی کرلوں گا۔

مرحوم کے ساتھیوں نے بذریعہ قرعہ اندازی ایک نائی کو ان کا جانشیں مقرر کیا۔ اس کا نام ماتا دین تھا۔ نئے راہ نما نے اپنی پہلی پریس کانفرنس میں اخباری نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک ممتاز راہ نما میں صرف دو خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہو اور وہ عوام کا سر مونڈ سکے۔ خدا کے فضل سے مجھ میں یہ دونوں خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں، اس لیے قوم کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں''۔

قوم نے ماتا دین کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور ساتھ ہی مطالبہ کیا کہ اسے مرحوم راہ نما کے آخری الفاظ سے آگاہ کیا جائے۔ ماتا دین اچھی طرح جانتے تھے کہ موت نے مرحوم کو الوداع تک کہنے کا موقع نہ دیا تھا، چہ جائیکہ وہ قوم کے لیے کوئی پیغام دے سکتے، لیکن قوم یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس کا خیال تھا جو شخص اپنی زندگی میں اتنا باتونی ہو کہ آئے دن اپنی تقریر سے عوام کو بور کرتا رہے وہ مرتے وقت کس طرح خاموش رہ سکتا تھا۔ ماتا دین نے وعدہ کیا وہ ایک ہفتہ کے بعد عوام کو مرحوم کے آخری الفاظ سے آگاہ کریں گے۔

سب سے پہلے ماتا دین نے مرحوم کی بیوی سے انٹرویو کیا۔ ''ہمارے محبوب راہ نما اور آپ کے فرشتہ سیرت شوہر نے موت سے دو ایک دن پہلے آپ سے کیا گفتگو کی تھی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں صداقت سے کام لوں تو آپ کو ان کی گفتگو کے بارے میں بڑی مایوسی ہوگی''۔

''پھر بھی انہوں نے کیا کہا تھا؟''۔

''انہوں نے کہا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا تمہارا جوبن اتنی جلدی ڈھل جائے گا، اگر تم برا نہ مانو تو میں تم کو طلاق دے دوں''۔

''اس کے علاوہ اور کیا باتیں ہوئیں''۔

''یہ کہ تم خواہ مخواہ میری مے نوشی پر اعتراض کرتی ہو۔ تم جانتی ہو شراب پیے بغیر میں نشہ بندی پر تقریر نہیں کر سکتا''۔

''اس کے علاوہ؟''۔

''اس کے علاوہ یہ کہا تھا جب ہماری شادی ہوئی تھی تو تم میکے سے اپنے ساتھ ایک خادمہ لائی تھیں جو بہت قبول صورت تھی، لیکن دو ماہ کے بعد تم نے اسے ملازمت سے جواب دے دیا تھا۔ محض اس شک پر کہ وہ مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھیں۔ میں تمہارے اس گناہ کو آج تک معاف نہیں کر سکا''۔

''اور بھی کچھ کہا تھا انہوں نے''۔

''انہوں نے کہا تھا حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ کسی وقت بھی کوئی بڑا دھماکا ہو سکتا ہے، اس لیے مناسب ہوگا ہم بیس پچیس لاکھ روپیہ کسی غیر ملکی بینک میں جمع کرا دیں اور جوں ہی عوام بغاوت کا جھنڈا بلند کریں، بذریعہ ہوائی جہاز یہاں سے بھاگ نکلیں''۔

''تو کیا انہوں نے اتنا روپیہ کسی بینک میں جمع کرا دیا تھا؟''۔

''نہیں۔ کیونکہ دوسرے دن ان کا انتقال ہو گیا''۔

مرحوم راہ نما کی بیوی نے جتنی بھی باتیں بتائی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی کام کی نہ تھی، اس لیے ماتا دین نے مرحوم کے بڑے لڑکے سے سوال کیا۔ ''آپ کے والد نے آپ سے آخری ملاقات کے دوران کیا کہا تھا؟''

''انہوں نے مجھے بے وقوف، چغد، نالائق وغیرہ کہنے کے بعد نصیحت کی تھی کہ غریب لڑکیوں کا تعاقب نہیں کرنا چاہیے۔ چاہے وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں۔ اگر عشق کرنا ہی ہے تو کسی رئیس کی لڑکی سے کرنا چاہیے تاکہ جہیز میں کافی روپیہ ملے''۔

''اور پھر کچھ کہا تھا انہوں نے؟''۔

''جی ہاں۔ یہ کہا تھا۔تم متواتر چار سال سے بی۔اے کے امتحان میں فیل ہو رہے ہو۔تمہاری کامیابی کا انحصار صرف دو باتوں پر ہے۔امتحان دیتے وقت تمہیں نقل کرنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں اور ممتحنوں سے مل کر تمہیں رعائتی نمبر دلائے جائیں''۔

''مرحوم راہ نما آپ کو کون سا پیشہ اختیار کرنے کے لیے کہتے تھے؟''۔

''ان کا کہنا تھا اپنے وطن میں بہترین پیشہ سیاست ہے۔ان کی دلی خواہش تھی میں ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے قوم کی راہ نمائی کر سکوں''۔

''وہ کہتے تھے اس پیشے میں سرمایہ لگائے بغیر انسان سرمایہ دار بن سکتا ہے''۔

''کیا وہ ایسا کہنے میں حق بجانب تھے؟''۔

''جی ہاں۔ان کی اپنی مثال ان کے سامنے تھی۔وہ ایک غریب تیلی کے بیٹے تھے جسے دو وقت کھانا بھی مشکل سے ملتا تھا،لیکن سیاست میں حصہ لینے کے بعد ان کے وارے نیارے ہو گئے تھے۔کبھی کبھی ہنسی مذاق میں فرمایا کرتے تھے۔میں تیلی کا بیٹا ہوں،قوم کا تیل نکال کر چھوڑوں گا''۔

ماتا دین کو یہاں بھی مایوسی ہوئی۔اب انہوں نے مرحوم کی بڑی صاحبزادی سے بات کی۔ اس نے انہیں بتایا کہ مرحوم نے اپنی موت سے ایک دن پہلے اس سے کہا تھا''پرانے زمانے اور آج کل کی لڑکی میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ وہ لڑکیوں میں کھیلتی تھی اور یہ لڑکوں میں کھیلتی ہے۔تم کافی سمجھ دار ہو۔پھر بھی پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔کہیں کسی ایسے نوجوان کے جال میں پھنس نہ جانا جو قرض کے مے پیتا اور ٹکٹ کے بغیر سفر کرتا ہے۔لڑکی وہ ذہین ہوتی ہے جو امیر ترین شوہر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے''۔

اس انٹرویو کے بعد ماتا دین نے مرحوم کے کسی رشتے دار سے ملنا مناسب نہ سمجھا۔حسن اتفاق سے انہیں مرحوم کی ایک ذاتی ڈائری مل گئی جس میں کئی قسم کے اندراجات تھے۔ماتا دین بڑے غور سے ان کا مطالعہ کرنے لگے۔

18 فروری کو مرحوم نے لکھا تھا۔آج کا دن بہت اچھا رہا۔مس میم سے ملاقات ہوئی۔ چھوکری بری نہیں۔چالاک بھی کافی معلوم ہوتی ہے۔سونے کی اسمگلنگ میں اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔کوئی شک بھی نہ کرے گا۔میں نے اسے منافع میں دس فیصد کی پیش کش کی ہے لیکن وہ ابھی نہیں مانتی۔امید ہے پندرہ فی صد پر مان جائے گی۔

4 مارچ۔ سیٹھ ''گاف لام'' ٹین کا کوٹا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر پچاس ہزار بطور نذرانہ دے سکیں تو انہیں کوٹا دلوا دینا چاہیے۔

25 اپریل کو انہوں نے ایک ایسی دعوت کا ذکر کیا تھا جس کے آخر میں ایک مشہور رقاصہ نے نیم برہنہ حالت میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ مرحوم نے رقاصہ کے خدوخال کو چٹخارے لے لے کر بیان کیا تھا۔

6 مئی کو انہوں نے صرف دو سطریں لکھی تھیں۔ سیاست اور ایمانداری میں کوئی تعلق نہیں۔ میری رائے میں ایماندار سیاستدان سے زیادہ بے وقوف شخص مشکل سے ملے گا۔

ماتا دین جوں جوں ڈائری کے اوراق پلٹتے گئے، ان کے چہرے کا رنگ اڑتا گیا اور اس اندراج پر تو انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''اس خوبصورت بیوہ کو بیوی بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ ڈاکٹر ایل۔ سنی سے مل کر اپنی بدصورت رفیقہ حیات کو زہر دے دیا جائے''۔

ماتا دین نے ڈائری بند کر دی اور فیصلہ کیا کہ خود ہی ایک بیان لکھ کر اسے مرحوم راہ نما کے آخری الفاظ کا نام دے دیا جائے۔ بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ لکھے۔

پیارے ہم وطنو! کاش میں کچھ برس اور زندہ رہتا اور آپ کی مزید خدمت کر سکتا۔ لیکن افسوس خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ عزیزو! میں نے ہمیشہ قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کوشش کی کہ ہر قسم کی رشوت خوری ختم کی جائے۔ نشہ بندی تحریک کو کامیاب بنایا جائے، مادی اقدار کی بجائے روحانی اقدار کی سرپرستی کی جائے، ہوس پرست شوہروں کو سمجھایا جائے کہ وہ اپنی بدصورت بیویوں سے نفرت نہ کریں، جہیز کی لعنت کو قلع قمع کیا جائے بیواؤں کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جائے، ایسی فلموں اور کتابوں پر مقدمے چلائے جائیں جو نوجوانوں کے اخلاق کو تباہ کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر قوم نے میرے ان آخری الفاظ پر عمل کیا تو اس کا مستقبل نہایت تابدار ہوگا''۔

ایک ہفتے بعد سب ماتا دین نے مرحوم راہ نما کے آخری الفاظ قوم کو پڑھ کر سنائے تو اس نے بیک زبان ذوق کا یہ مصرع دہرایا:

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے!

☆☆☆

بات تو سنئے

آپ پوچھتے ہیں کہ میں گھر سے باہر کیوں نکلتا، گوشہ نشینی کیوں اختیار کر لی ہے، کیا گھر میں بیٹھے بیٹھے میری طبیعت نہیں اوبتی؟ کیا میری صحت خراب نہیں ہو جائے گی؟ آپ بجا فرماتے ہیں۔ لیکن آپ خود ہی کہئے کہ میں گھر سے کیسے نکل سکتا ہوں، بدقسمتی سے ایسے محلے میں رہتا ہوں جہاں سب ریٹائرڈ لوگ رہائش پذیر ہیں۔ یوں تو قریب قریب ہر پڑھا لکھا شخص باتونی ہوتا ہے لیکن ریٹائرڈ لوگ تو گویا پیشہ ور باتونی ہوتے ہیں، لیجئے میں ابھی گھر سے نکلا ہوں کہ صوبیدار صاحب نے پکار کر کہا۔ ''اجی پروفیسر صاحب کہاں چل دیئے، بات تو سنئے، آیئے آپ کا تعارف اپنے نئے کتے سے کرائیں''۔ جی ذرا ڈاک خانے تک چلا ہوں، ایک ضروری خط ڈالنا ہے'' میں بڑی عاجزی سے کہتا ہوں۔ صوبیدار صاحب گرج کر فرماتے ہیں۔ ''اجی چھوڑیئے خط، آج کی ڈاک سے نہیں جائے گا، تو کون سی قیامت آ جائے گی، مجھے دیکھئے تین مہینے خط کا جواب لکھنے میں صرف کرتا ہوں اور تین مہینے خط ڈالنے میں، ادھر آیئے آپ کو ایک چیز دکھائیں''۔ اور وہ چیز ہے ان کا السیشن کتا۔ ایسا خونخوار کتا دیکھ کر میرا تو خون خشک ہو رہا ہے کہ اگر کم بخت نے حملہ کر دیا تو۔ لیکن صوبیدار صاحب ہیں کہ کتے کی تعریف میں قصیدے پر قصیدہ پڑھ رہے ہیں۔ ''جناب کتے تو ہم نے کئی پالے لیکن کیا بات ہے اس السیشن کی، اتنا ذہین، اتنا فرمانبردار، اتنا دلچسپ کہ کئی دفعہ شک ہونے لگتا ہے کہ یہ کتا ہے کہ معجزہ! آپ نے میرا وہ کتا دیکھا تھا جس کا نام تھا پسٹل اور وہ بھی دیکھا ہوگا جسے میں ایٹم کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ لیکن بخدا پروفیسر صاحب، پسٹل اور ایٹم اس کتے کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی ہر بات ہی الگ ہے۔ بھونکنے ہی کو لیجئے، ویسے تو بھونکنا ہر کتے کی عادت ہی ہے لیکن جناب جب یہ بھونکتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بھونک نہیں رہا شعر پڑھ رہا ہے۔ شعر نہیں پڑھ رہا ہے، دربار کا الاپ کر رہا ہے، کبھی سنئے اسے بھونکتے ہوئے۔ ایک اور وصف جو اس میں ہے وہ یہ..... ''قطع کلام معاف'' میں ان کی بات کاٹ کر کہتا ہوں ''میں پھر حاضر ہوں گا، ڈاک کا وقت ہو رہا ہے''۔

مشکل سے پندرہ بیس گز کا فاصلہ طے کرتا ہوں کہ ماسٹر روڑقی رام چلا کر کہتے ہیں، پروفیسر صاحب، میں نے کہا، پروفیسر صاحب ایک منٹ صرف ایک منٹ'' ماسٹر روڑقی رام کو معمے حل کرنے کا

جنون ہے، اس لیے جب بھی ملتے ہیں معموں کی بات کرتے ہیں۔ ''اچھا پروفیسر صاحب اشارہ ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو زندگی کا مزا نہیں آتا، ممکن الفاظ ہیں، بیوی اور بجلی، اچھا آپ کے خیال میں کون سا لفظ ٹھیک رہے گا''۔ جی میرے خیال میں تو بجلی موزوں جواب ہے''۔ ''کیسے؟''۔

''اس طرح کہ بیوی کے گھر آتے ہی زندگی کا سارا مزا جاتا رہتا ہے''۔ ''یہ تو عجیب منطق ہے۔ اچھا خیر اپنا اپنا خیال ہے، ہاں دوسرا اشارہ ہے کہ اگر چل جائے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ ممکن الفاظ ہیں کھوٹی اٹھنی، کھوٹی چونی''۔

''میرے خیال میں کھوٹی اٹھنی ٹھیک ہے''۔

''کیوں؟''۔

''کیونکہ اگر کھوٹی چونی کے بجائے کھوٹی اٹھنی چل جائے تو زیادہ فائدہ ہے''۔

''خوب خوب یہ دلیل واقعی مضبوط ہے۔ کھوٹی اٹھنی ہی لکھوں گا''۔

ماسٹر رونقی رام سے جان چھڑا کر آگے چلتا ہوں کہ ڈاکٹر بانکے باری راستہ گھیر لیتے ہیں۔ ''اخاہ پروفیسر صاحب، میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا، مجھے معلوم ہے آپ اس وقت ضرور ادھر سے گزرتے ہیں۔ آیئے آپ کو تازہ افسانہ سناؤں، عنوان ہے ہیضہ کا مریض''۔ ڈاکٹر بانکے باری کو افسانے لکھنے کا شوق ہے، ویسے اگر آپ ان کے افسانے سنیں تو خدا کا شکر بجالائیں کہ یہ ڈاکٹری کی جانب چلے گئے ورنہ افسانہ بے چارہ کسی کو منہ نہ دکھا سکتا، اب ڈاکٹر صاحب نے اپنا طویل افسانہ پڑھنا شروع کر دیا، یہ کوئی پچاس ساٹھ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ افسانہ پڑھ رہے ہیں، یہ دیکھ رہا ہوں کہ ابھی کتنے صفحے اور باقی ہیں، جی کڑا کر کے کبھی کبھی جواب دیتا جاتا ہوں کہ ناراض نہ ہو جائیں، دس صفحے سننے کے بعد ہمت اور صبر جواب دے دیتے ہیں، اس لیے جلدی سے ان سے معذرت کر کے ان کے کمرے سے بھاگتا ہوں۔

لیجئے ابھی چند قدم ہی چل سکا ہوں، شری شمبھو ناتھ نے اپنی مہین آواز میں پکارتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کہا جی ذرا بات تو سنئے'' شری سمبھو ناتھ ریٹائرڈ کلرک ہیں، ساٹھ پینسٹھ کے قریب عمر ہے، ہمیشہ پانچ چھ امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیجئے انہوں نے مجھے دیکھتے ہی اپنی گردن کی پشت پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''کل رات سے یہاں درد ہو رہا ہے اس کا کیا کروں؟''۔

''کسی ڈاکٹر کو دکھایئے''۔

''ڈاکٹر نے دیکھا ہے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا''۔

''تو کسی حکیم یا وید سے مشورہ کیجئے، وید سے بھی مشورہ کیا ہے''۔

''تو پھر ٹھیک ہے'' نہیں ٹھیک ہے درد بدستور ہے۔ آپ بتائیے کہ کیا کیا جائے؟'' ''تیل کی مالش کیجئے'' ''وٹو تی ہے'' ''سینک دیجئے'' ''وہ تو یاد ہے تو پھر اس پر برف کی تھیلی رکھیے۔''

''اجی پروفیسر صاحب آپ تو مذاق کرتے ہیں، اچھا چھوڑیئے چند دنوں سے بدہضمی کی شکایت ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی، آنکھیں سوج رہی ہیں، پیٹ پھول رہا ہے اس کا بتائیے کیا کیا جائے''۔ اب آپ ہی کہئے شری شمبھو ناتھ کے لیے کون سا نسخہ تجویز کیا جائے اور خاص کر جب معاملہ یہ ہو کہ خاکسار پروفیسر تو ضرور ہے لیکن ڈاکٹر بالکل نہیں۔ ''لالہ جی تر پھلا پھانکا کیجئے''۔ میں نے آہستہ سے کہا اور ان سے اجازت لیتا ہوں ہانپتے کانپتے ڈاکخانہ پہنچتا ہوں لیکن ڈاک کب کی جا چکی ہے۔ مایوس ہو کر گھر کی طرف لوٹتا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اگر واپسی پر بھی شری شمبھو ناتھ، ڈاکٹر بانکے باری، ماسٹر روتی رام یا صوبیدار صاحب سے تصادم ہو گیا تو آدھی رات سے پہلے گھر نہیں پہنچ سکتا۔

☆☆☆

غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں

(دور جدید کے شعرا کی ایک مجلس میں مرزا غالب کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس مجلس میں تقریباً تمام سہیل القدر جدید شعرا تشریف فرما ہیں۔ مثلاً من ارشد۔ ہیرا جی۔ ڈاکٹر قربان حسین خالص۔ میاں رفیق احمد خوگر۔ راجہ علی مہدی خاں۔ پروفیسر غیظ احمد غیظ۔ بکر ماجیت ورما۔ عبدالحی نگاہ وغیرہ وغیرہ۔ یکا یک مرزا غالب داخل ہوتے ہیں۔ ان کی شکل وصورت بعینہٖ وہی ہے جو مولانا حالی نے ''یادگار غالب'' میں بیان کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں ''دیوان غالب'' کا ایک نسخہ ہے۔ تمام شعرا کھڑے ہو کر آداب بجالاتے ہیں)۔

غالب:۔ حضرات میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا، اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ دور جدید کے شعرا سے شرف نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر:۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے وگرنہ

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب:۔ رہنے بھی دیجئے اس بے جا تعریف کو۔ من آنم کہ من دانم۔

دوسرا شاعر:۔ تشریف رکھئے گا۔ کہئے جنت میں خوب گذرتی ہے۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے، ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن۔

غالب:۔ (مسکرا کر) بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے۔ جب سے وہاں گیا ہوں، ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر:۔ تعجب! جنت میں تو آپ کو کافی فراغت ہے، اور پھر ہر ایک چیز میسر ہے۔ پینے کو شراب۔ انتقام لینے کو پری زاد..... اور اس پر یہ فکر کہ سوں دور کہ

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

باوجود اس کے آپ کچھ لکھ.....

تیسرا شاعر:۔ (بات کاٹ کر) سنائیے اقبال کا کیا حال ہے۔

غالب:۔ وہی جو اس دنیا میں تھا۔ دن رات خدا سے لڑنا جھگڑنا۔ وہی پرانی بحث

مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

پہلا شاعر:۔ میرے خیال میں وقت کافی ہو گیا ہے۔ اب مجلس کی کارروائی شروع کرنی چاہیے۔

دوسرا شاعر:۔ میں کرسی صدارت کے لیے جناب م۔ن۔ ارشد کا نام تجویز کرتا ہوں

(ارشد صاحب کرسی صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کرتے ہیں)

م۔ن۔ ارشد:۔ میرے خیال میں ابتدا مرزا غالب کے کلام سے ہونی چاہیے..... میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا کلام پڑھیں۔

غالب:۔ بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائے گی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر سنا دیں گے۔

م۔ن۔ ارشد:۔ معاف کیجئے گا۔ مرزا۔ اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں جائے گی، شمع کی بجائے یہاں پچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے۔ اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالب:۔ بہت اچھا صاحب تو غزل سنئے گا۔

باقی شعرا:۔ ارشاد

غالب:۔ عرض کیا ہے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

(باقی شعر ہنستے ہیں۔ مرزا حیران ہو کر ان کی جانب دیکھتے ہیں)

غالب:۔ اجی صاحب یہ کیا حرکت ہے۔ نہ داد نہ تحسین۔ اس بے موقع خندہ زنی کا مطلب؟

ایک شاعر:۔ معاف کیجئے مرزا میں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔

غالب:۔ بے معنی؟

ہیرا جی:۔ دیکھئے نا مرزا آپ فرماتے ہیں۔ خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔ اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا۔ اور آپ صرف معشوق کے نام کے ہی عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا ضرور سادہ کاغذ پر اس کا نام لکھ لیجئے۔

ڈاکٹر قربان حسین خالص:۔ میرے خیال میں اگر یہ شعر اس طرح لکھا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔

خط لکھیں گے کیونکہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو
جس طرح سے میری اک اک نظم کا
کچھ بھی تو مطلب نہیں۔
خط لکھیں گے کیونکہ الفت ہے ہمیں
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں
یعنی عاشق ہیں تمہارے نام کے

غالب:۔ یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہیرا جی:۔ جنوں! جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے، اگر اجازت ہو تو کہوں۔

غالب:۔ ہاں، ہاں بڑے شوق سے۔

ہیرا جی:۔ جنوں ہوا جنوں ہوا
مگر کہاں جنوں ہوا
کہاں ہوا وہ کب ہوا
ابھی ہوا یا اب ہوا
نہیں ہوں میں یہ جانتا
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق ہے
تو بس یہی ہے وجہ کہ
دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہوا جنوں ہوا

غالب:۔ (ہنسی کو روکتے ہوئے) ایجان اللہ کیا برجستہ اشعار ہیں۔

م۔ن۔ارشد:۔ اب مرزا، غزل کا دوسرا شعر فرمایئے۔

غالب:۔ میں اب مقطع ہی عرض کروں گا۔ کہا ہے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحی نگاہ:۔ گستاخی معاف مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔

غالب:۔ کس طرح؟

عبدالحی نگاہ:۔

عشق نے ہاں ہاں تمہارے عشق نے
عشق نے سمجھے تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا
اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں

اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیا بکتا ہوں میں
یعنی نکما کر دیا
اتنا تمہارے عشق نے
گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں
یعنی تمہارے عشق نے
اتنا نکما کر دیا۔

غالب:۔ (طنزاً) بہت خوب۔ بھئی غضب کر دیا۔

غیظ احمد غیظ:۔ اور دوسرا مصرع اس طرح لکھا جا سکتا تھا۔

جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں۔
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی
اور آدمی تھا کام کا
لیکن تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا

غالب:۔ واللہ کمال ہی تو کر دیا بھئی۔ اب آپ لوگ اپنا اپنا کلام سنائیں۔

م۔ن۔ ارشد:۔ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص جو جدید شاعری کے امام ہیں اپنا کلام سنائیں گے۔

ڈاکٹر خالص:۔ اجی ارشد صاحب میں کیا کہوں۔ اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں۔ آپ جدید شاعری کی منزل ہیں اور میں سنگ میل۔ اس لیے آپ اپنا کلام پہلے پڑھئے۔

م۔ن۔ ارشد:۔ توبہ توبہ! اتنی کسر نفسی۔ اچھا اگر آپ مصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے ''بدلہ'' عرض کیا ہے۔

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسن دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانۂ ویرانی نہیں جاتی

یا جب وہ اپنے شوہر کو کسی اور شوہر پر رشک کرتے ہوئے دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی ہے۔ پنڈت ہری چند اختر نے خوب کہا ہے:

زمانے کو کیا کیا دیا دینے والے
مگر ہم کو ٹرخا دیا دینے والے

قریب قریب ہر شوہر جس وقت کام پر جانے لگتا ہے، اس پر غیر حاضر دماغی کا دورہ پڑتا ہے۔ چنانچہ کبھی وہ چلا کر پوچھتا ہے "میری عینک کہاں ہے؟ کبھی کہتا ہے، میرا قلم کدھر گیا؟ یا میری ٹوپی کون لے گیا؟" ایک اچھی بیوی ایک ہوشیار سراغ رساں کی طرح اپنے شوہر کی تمام کھوئی ہوئی چیزوں کو ڈھونڈھ کر لاتی ہے۔ وہ اسے مطلع کرتی ہے کہ اس کی عینک باتھ روم میں پڑی ہوئی ہے، اس کا قلم میز کے نیچے گرا پڑا ہے، میز کے اوپر نہیں ہے اور اس کی ٹوپی اس کے سر پر ہے۔

ایک ہوشیار بیوی یہ بھی جانتی ہے کہ چاہے گھر میں کتنے ہی ضدی بچے ہوں لیکن گھر میں سب سے زیادہ ضدی بچہ شوہر ہوتا ہے۔ وہ عموماً ضد کی شروعات اس وقت کرتا ہے جب باقی بچے ضد کرنے کے بعد سو جاتے ہیں حالانکہ اس کی ضد نہایت نامعقول قسم کی ہوتی ہے۔ لیکن ایک تجربہ کار بیوی یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ "بال ہٹ" ہے۔ اسے پوری کرنے میں خیریت سمجھتی ہے۔ اس کے برعکس ایک ناتجربہ کار بیوی وہ ہنگامہ برپا کرتی ہے کہ بیچارے شوہر کی زبان پر بے اختیار امیر مینائی کا یہ شعر

دن نہیں، رات نہیں، صبح نہیں، شام نہیں
رہ گئی ایک نہیں، ہاں کا بھی نام نہیں

دراصل شوہر کو خوش رکھنا ایک آرٹ ہے اور اگر بیوی کو یہ آرٹ نہیں آتا تو اسے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسے کچھ بھی نہیں آتا یعنی بی۔ اے یا ایم۔ اے ہونے کے باوجود وہ ان پڑھ ہے۔ اسے اس مختصر مضمون کو غور سے پڑھنا چاہیے۔ البتہ اگر خوش قسمتی سے اس کا شوہر زن مرید ہے تو پھر صرف آنکھیں دکھا کر یا ایک ہلکی سی دھمکی دے کر ہی سیدھی راہ پر لایا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

حاذق صاحب

نام تو ان کا کچھ اور ہے لیکن ہم سب انہیں حاذق صاحب کہتے ہیں اور یہ مناسب بھی ہے۔ آخر جس شخص کا پیشہ سات پشت سے ''حکمت'' رہا ہو، اسے حاذق نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔ حاذق صاحب کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے علمِ طب کا باقاعدہ مطالعہ کسی مکتب، کالج یا یونیورسٹی میں نہیں کیا۔ اس کے باوجود وہ یونانی حکیم جالینوس کے بعد سب سے بڑے حکیم حاذق ہیں۔ اکثر بڑے فخر کے ساتھ فرمایا کرتے ہیں۔

''ہمیں علم طب ورثے میں ملا ہے۔ خدا بخشے پڑ دادا جان مرحوم ہر مرض کا علاج جامن کی گٹھلی سے کیا کرتے تھے، پیچش کے لیے گٹھلیوں کا جوشاندہ تجویز کرتے، مرگی کے مریض کو گٹھلیوں کا سفوف سنگھایا کرتے، تپ دق کے روگی کو صبح و شام ایک ایک گٹھلی بکری کے دودھ کے ساتھ لینے کے لیے کہتے، ان کی رائے میں گٹھلی کی وہی حیثیت تھی جو ایلوپیتھی میں وٹامن کے کیپسول کی ہوتی ہے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے تھے۔ گٹھلی کو دیکھ کر ہی کیپسول کی ایجاد کی گئی۔

دادا جان مرحوم ہر مرض کا علاج ہینگ سے کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا، ہینگ ایک سو ایک امراض کا علاج ہے۔ اگر کوئی شخص چار رتی ہینگ روزانہ پھانک لیا کرے تو وہ سو سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ انہوں نے خود اسی برس کی عمر پائی کیونکہ اناسی برس کے بعد انہوں نے ہینگ کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ والد صاحب مرحوم لہسن کو اکسیرِ اعظم تصور کرتے تھے۔ ان کے مطب میں اس کے علاوہ کوئی اور دوا نہ تھی۔ درد سر سے لے کر جتنے امراض ہیں۔ ان کا واحد علاج لہسن تھا۔

چونکہ حاذق صاحب نے اپنے بزرگوں سے بہت کچھ سیکھا ہے، اس لیے انہوں نے جامن کی گٹھلی، ہینگ اور لہسن کے مرکب سے ایک نئی دوا تیار کی ہے۔ جس کا نام ''معجونِ حاذق'' رکھا ہے۔ پچھلے پچیس برس سے وہ یہ معجون اپنے مریضوں کے لیے تجویز کر رہے ہیں۔ لاعلاج سے لاعلاج مرض کے لیے یہ معجون اکسیر ثابت ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ وہ مریض جن کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹروں نے رشتہ داروں کو صبر اور مریض کو وصیت کرنے کی تلقین کی تھی،

معجون حاذق کی صرف ایک خوراک کھانے کے بعد چارپائی سے چھلانگ لگا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور جو کہا جاتا ہے، ایک دفعہ مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا تھا۔ یہ معجزہ بھی معجون حاذق کی بدولت رونما ہوا تھا۔

حاذق صاحب کو ایلوپیتھی سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ وہ اس کا ذکر بڑے حقارت آمیز لہجے میں کیا کرتے ہیں۔ ان کی دانست میں سب ایلوپیتھک دوائیں، زہر ہوتی ہیں اور زہر سے مرض کا علاج حماقت ہی نہیں بلکہ پاگل پن ہے۔ یہی وجہ ہے آج کل اتنے امراض سے نہیں مرتے جتنے علاج سے۔ حاذق صاحب کا یہ بھی خیال ہے الرجی نام کی کوئی چیز نہیں۔ در اصل جب ایلوپیتھک ڈاکٹر مرض کی تشخیص کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو اپنی خفت مٹانے کے لیے الرجی کا سہارا لیتے ہیں۔ اگر الرجی کا علاج پوچھو تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں یا دو ایک اوٹ پٹانگ دوائیں تجویز کر دیتے ہیں۔ جب ان سے فائدہ نہیں ہوتا تو کہتے ہیں۔ ''آپ کی الرجی لاعلاج ہے، بھلا کوئی ان سے پوچھے، اگر آپ مریض کا علاج نہیں کر سکتے پھر آپ کس مرض کی دوا ہیں۔

حاذق صاحب میں یہ وصف ہے وہ کسی مرض کا لاعلاج نہیں سمجھتے۔ جب کوئی مریض انہیں بتاتا ہے، فلاں ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے۔ وہ اس ڈاکٹر کو بے نقط سنانے کے بعد کہتے ہیں۔ بھلا اس جاہل کو کیا پتا تشخیص کسی چیز کا نام ہے۔ آپ کو دمہ ہرگز نہیں۔ آپ کا صرف جگر خراب ہے۔ آپ تین ماہ معجون حاذق استعمال کیجئے، آپ تندرست ہو جائیں گے۔ حاذق صاحب کی رائے میں ہر ایک مرض کے لیے جگر کی خرابی کو ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے چنانچہ جس شخص کے کان میں درد ہے، اس کا جگر خراب ہے اور جو مریض داڑھ کے درد میں مبتلا ہے، اسے داڑھ نکلوانے کی بجائے جگر کا علاج کرنا چاہیے۔ حاذق صاحب دانت نکلوانے کے سخت خلاف ہیں۔ دلیل وہ یہ دیتے ہیں اگر آنکھ دکھتی ہو تو آپ کو کوئی یہ مشورہ نہیں دے گا، آنکھ نکلوا دیجئے، پھر دانت نکلوانے کا مشورہ کیوں دیا جاتا ہے۔ اسی لیے تا کہ آنکھیں صرف دو ہیں اور دانت بتیس ہیں۔

حاذق صاحب اکثر فرمایا کرتے ہیں۔ جو مریض معجون حاذق استعمال کرنے کے بعد بھی مرض سے نجات نہیں پا سکتا، وہ اس ڈھیٹ کی طرح ہے جس نے مسیح کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا تھا:

علاج درد دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا
تم اچھا کر نہیں سکتے میں اچھا ہو نہیں سکتا

حاذق صاحب کے اکثر مریض جانبر نہیں ہوتے۔ لیکن اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ خدا کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے۔ حاذق صاحب کسی مریض کے اللہ کو پیارے ہو جانے کی خبر سنتے ہیں انہیں بے اختیار یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

کہا اس بت سے مرتا ہوں، تو مومن
کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

مناسب ہوگا اگر یہاں بتا دیا جائے کہ مریض کی تشخیص کس طرح کرتے ہیں۔ ایک شخص جسے ہائی بلڈ پریشر کی شکایت تھی، ان سے مشورہ کرنے کے لیے آیا۔ اس نے حاذق صاحب کو بتایا کہ ڈاکٹروں نے اسے نمک اور چربی والی غذا کو ترک کر دینے کے لیے کہا ہے۔ یہ سنکر حاذق صاحب آپے سے باہر ہو گئے اور ڈاکٹروں کو جاہل بے وقوف اور نااہل کہنے کے بعد فرمایا۔

''آپ کو خواہ مخواہ گمراہ کیا جا رہا ہے، آپ جتنا نمک کھانا چاہیں کھا سکتے ہیں۔ اگر نمک کھانے سے بلڈ پریشر ہو جاتا ہے تو تمام لوگ اس مرض میں مبتلا ہو جاتے..... رہی چربی والی غذا تو یہ اگر نہ کھائی جائے، انسان روز بروز کمزور ہوتا جاتا ہے اور آخر ایک دن یہ کمزوری جان لیوا ثابت ہوتی ہے''۔ ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ شخص نمک اور چربی والی غذا کھاتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ماہ کے بعد چل بسا۔ حاذق صاحب کو اب بھی خیال ہے اس کی موت بلڈ پریشر کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس کا جگر خراب تھا۔

ایک اور مریض جو دل کی بیماری میں مبتلا تھا۔ حاذق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور درخواست کی کہ اس مرض کے علاج کے لیے کوئی آزمودہ نسخہ بتائیں، حاذق صاحب نے ان کا طبی معائنہ کرنے کے بعد انکشاف کیا اسے دل کی بیماری ہرگز نہیں، بدہضمی کی شکایت ہے جس کا واحد علاج معجون حاذق ہے۔ انہوں نے مریض کو اس کا ایک ایک تولہ بھینس کے دودھ کے ساتھ صبح و شام لینے کے لیے کہا۔ تین ہفتوں کے بعد اس کی موت ہو گئی۔ حاذق صاحب کو جب یہ پتا چلا تو بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''یا تو وہ دوا بھینس کے دودھ کے ساتھ لیتا نہیں رہا، یا جس بھینس کے دودھ کے ساتھ لیتا تھا وہ بیمار تھی۔ بہر حال اس میں معجون حاذق کو کوئی

قصور نہیں..... ان جراثیم کا قصور ہے جو بھینس کے دودھ میں پائے جاتے ہیں''۔

خدا، حکیم حاذق صاحب کو خوش رکھے۔ اس دور میں جب کہ قابل حکیم کمیاب بلکہ نایاب ہوتے جا رہے ہیں، ان کا دم غنیمت ہے، کیونکہ قبرستانوں کی ساری رونق ان کے دم قدم سے ہے، جس دن وہ چل بسے قبرستان ویران ہو جائیں گے۔

☆☆☆

ریٹائرڈ لوگ

عام آدمیوں کی طرح ہم بھی سمجھتے تھے ایک ریٹائرڈ شخص کو کوئی نہیں پوچھتا۔ جب ہم خود ملازمت سے فارغ ہوئے تو پتا چلا ریٹائرڈ آدمی کو اور کوئی پوچھے یا نہ پوچھے، باقی ریٹائرڈ لوگ ضرور پوچھتے ہیں۔

ریٹائرڈ ہونے کے بعد پہلا دن تھا کہ ایک بزرگ لاٹھی ٹیکتے ہوئے تشریف لائے اور ہمیں یہ مژدہ سنایا کہ ہم بھی ان کی برادری میں شامل ہو گئے ہیں۔ ہمیں اس اطلاع سے کوئی خاص مسرت نہیں ہوئی کیونکہ ان کی جسمانی حالت نہایت قابل رحم تھی اور ایسی برادری کو دور سے ہی سلام کرنے میں خیریت تھی۔ ہم نے رسمی طور پر ان کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔ وہ ہمارے ساتھ صوفے پر بیٹھ کر ہر چیز کو گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا ان کی بینائی نہایت کمزور ہے، اس لیے انہیں ہر چیز پر کسی اور چیز کا گمان ہوتا ہے۔ ایش ٹرے کو دیکھ کر کہنے لگے: ''آپ کی یہ دوات بڑی خوبصورت ہے، یہ آپ نے کہاں سے لی''۔ دیوار پر لٹکی ہوئی مشہور شاعر کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو یہ دارا دستگھ پہلوان ہے، سنا ہے آج کل اس نے پہلوانی ترک کر دی ہے اور فلمیں بنا رہا ہے''۔ آتش دان پر رکھی ہوئی ہماری فوٹو کو ملاحظہ کرنے کے بعد فرمایا ''یہ شخص ضرور آپ کے کوئی بزرگ ہو گذرے ہیں، کیونکہ ان کی شکل آپ سے کافی ملتی جلتی ہے''۔ جب سب چیزوں کو گھور گھور کر دیکھنے کے بعد تھک سے گئے تو دو ایک بار کھانس کر گلا صاف کیا اور اللہ کا نام لے کر اپنی تقریر کا آغاز کر دیا۔ ان کی تقریر سن کر محسوس ہوا۔ عورت کے علاوہ ریٹائرڈ شخص ہی وہ خدا کا بندہ ہے جو ہر موضوع پر فی البدیہہ تقریر کر سکتا ہے اور بعض اوقات تو موضوع کے بغیر بھی بے تکان بول سکتا ہے۔ ویسے تو انہوں نے اپنی تقریر

میں سیکڑوں کارآمد نکتے بیان کیے۔ لیکن ان کے کچھ اقوال تو موتیوں میں تولنے کے قابل تھے۔ فرمایا ''موت کی طرح ریٹائرمنٹ بھی ناگزیر ہے۔ ان سے ذرا کم خوش قسمت وہ ہیں جو ریٹائر ہو جاتے ہیں لیکن زندگی سے ریٹائر ہونے کا نام نہیں لیتے۔''

ایک ریٹائرڈ آدمی کا حافظہ جتنا کمزور ہوگا، اتنا ہی وہ خوش رہے گا۔ ورنہ جب بھی اسے اپنے شان دار ماضی کی یاد آئے گی۔

دل شاہ جہان پوری کا یہ شعر اس کو تڑپا کر رہ جائے گا ۔

بہار عہد ماضی کے ابھی نقشے ہیں نظروں میں
چمن تو مٹ گیا لیکن چمن کی یاد آتی ہے

دراصل اسے تو عدم کی طرح یہ دعا مانگنی چاہیے ۔

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ایک ریٹائرڈ آدمی کو نوجوانوں کی صحبت سے احتراز کرنا چاہیے ورنہ اس پر پھبتی کسی جائے گی کہ وہ سینگ کٹوا کر بچھڑوں میں شامل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے، وہ اپنے چھوٹوں سے کبھی توقع نہ کرے کہ وہ اس کی عزت کریں گے۔ اسے ہی غنیمت سمجھے کہ وہ اس کا مذاق نہیں اڑاتے۔

اگلے وقتوں میں ریٹائر ہو کر لوگ سماج کی خدمت کیا کرتے تھے، آج کل ایسا کرنا دانش مندی کے خلاف ہے۔ سماج اتنا بگڑ چکا ہے کہ اسے کوئی ٹھیک نہیں کر سکتا، آج کل تو یہی بہتر ہے ایک ریٹائرڈ آدمی ہم جنسوں کے ساتھ شطرنج کھیلے، اخبار پڑھے، خبروں پر تبصرہ کرے اور سماج کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔

انہوں نے تقریر کی تان اس فقرے پر توڑی، مانسرور پارک میں ہر روز ریٹائرڈ آدمی وقت گزرانے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں، اس لیے ہم کل سے وہاں جایا کریں۔ ہم نے یہ سمجھتے ہوئے وہاں وقت اچھی طرح گزرے گا، ریٹائرڈ آدمیوں کی کلب میں شامل ہونا منظور کر لیا۔

دوسرے دن ہم نے مانسرور پارک میں جا کر دیکھا ریٹائرڈ آدمیوں کی ایک فوج ظفر موج ہے جس نے پارک کے ایک بہت بڑے حصے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس میں ہر قسم کے لوگ شامل

ہیں۔ وہ جو حد سے زیادہ ضعیف ہیں اور قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے ہیں، وہ جو کسی بیماری کی وجہ سے اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے قبر میں سے نکل کر آئے ہیں۔ ہم ایک بزرگ کے پاس بیٹھ گئے اور بڑے ادب کے ساتھ پوچھا۔

''کہئے مزاج کیسا ہے''۔ وہ کافی اونچا سنتے تھے۔ کہنے لگے۔ ''ہاں موسم تو بہت اچھا ہے''۔ ہم نے ذرا اونچی آواز میں دہرایا۔ ''آپ کا مزاج کیسا ہے''۔ گنگنانے کی آواز میں بولے۔ ''سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے''۔ دو منٹ کے وقفہ کے بعد ہم نے ان کی توجہ پارک میں اگے ہوئے پھولوں کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔ ''بہت خوبصورت پھول ہیں''۔ انہوں نے حیران ہو کر کہا۔ ''پھول کہاں ہیں، مجھے تو ایک بھی پھول نظر نہیں آتا''۔ بعد میں پتا چلا کہ ان کی دونوں آنکھوں میں موتیا بند ہے، اس لیے انہیں دور کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ ہم وہاں سے اٹھ کر ایک اور بزرگ کے قریب جا بیٹھے۔ وہ کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ہم نے دریافت کیا۔ ''یہ کون سی کتاب ہے!''۔ بولے۔ ''یوگ وششٹ ہے''۔ ہم نے پوچھا۔ ''اس میں جو کچھ لکھا ہے کیا وہ آپ کی سمجھ میں آ جاتا ہے''۔ فرمایا۔ سمجھ میں آئے نہ آئے، وقت تو کٹ جاتا ہے''۔ ہم نے عرض کی۔ ''کچھ ہمیں بھی بتائیے''۔ کہنے لگے ''یہ چیزیں بتانے کی نہیں ہوتیں، اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے تو یہ کتاب خرید لیجئے''

ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اب ہم نے ایک اور شخص کو، جو اخبار پڑھ رہا تھا۔ مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کہئے تازہ خبر کیا ہے؟''۔ انہوں نے اپنی عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں ہمیں گھور کر دیکھا اور پھر بولے۔ ''یہ پرسوں کا اخبار ہے۔ اس میں تازہ خبر تلاش کرنا بے سود ہے..... اگر آپ ضروری تازہ خبر جاننا چاہتے ہیں تو آج کا اخبار پڑھیئے''۔

ان تینوں حضرات سے مل کر اتنی مایوسی ہوئی کہ ہم گھر لوٹ آئے۔ دو ایک دن پارک میں نہ گئے۔ پھر ایک دن یہ سوچتے ہوئے کہ شاید آج بہتر قسم کے لوگوں سے ملاقات ہو، ہم نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ اس دن ریٹائرڈ لوگ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ اس مسئلہ پر بحث کر رہا تھا، نئی نسل ایک دم بے راہ روی کا شکار ہو گئی ہے۔ والدین سے ڈرنے کی بجائے انہیں ڈراتی ہے۔ دوسرا گروپ اس بات کی چھان پھٹک کر رہا تھا کہ جوڑوں کی درد کی بہترین دوا کون سی ہے۔ تیسری ٹولی اس امر کی شکایت کر رہی تھی، بہوئیں ظالم ہو گئیں ہیں،

بوڑھے سسر اور ساس کی خدمت نہیں کرتیں۔ چوتھی جماعت اس زمانے کا ذکر کر رہی تھی جب خالص گھی ایک روپیہ فی سیر بکا کرتا تھا اور جب چائے کی بجائے لسی پیا کرتے تھے۔

قریب قریب سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ گذرا ہوا زمانہ بے نظیر تھا۔ تب نوجوان والدین کی عزت کیا کرتے تھے، لوگ جوڑوں کے درد میں مبتلا نہیں ہوتے تھے، بہوئیں بڑی سعادت مند ہوا کرتی تھیں۔

جب ہم نے ڈرتے ڈرتے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے، بڑے بوڑھے اور بزرگ قسم کے لوگ یہی کہتے آئے ہیں۔ تمام سامعین پنجے جھاڑ کر ہمارے پیچھے پڑ گئے اور ہمیں ان سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑانا پڑا، ہم نے یہ بات یونہی مذاق میں کہی تھی۔

وہ دن اور آج کا دن، ہم مانسرور پارک میں نہیں گئے۔ اب ہمارا یہ یقین روز بروز پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ ریٹائرڈ ہونے کے بعد آدمی گھر سے باہر نہ نکلے اور اگر اسے نکلنا ہی پڑے تو مانسرور پارک کی بجائے کسی ایسے صحرا کا رخ کرے، جہاں اس کے سوا کوئی نہ ہو۔ وہاں کسی کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھ کر کسی دلچسپ کتاب کا مطالعہ کرے اور جب پڑھتے پڑھتے تھک جائے تو یہ شعر گنگنائے۔

سمجھ کر رکھیو قدم دشت خار پر مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

☆☆☆

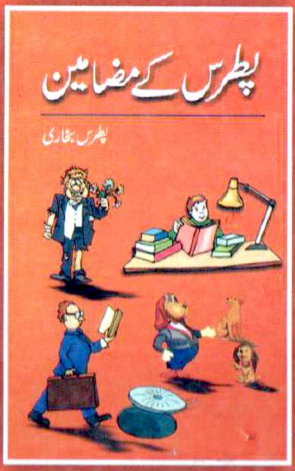

Nazeer Sons Publishers

نذیر سنز پبلشرز

۴۰۔اے اردو بازار لاہور، پاکستان فون: 7123219